SEPTEMBER
2024

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

میرے خواب بولتے ہیں
شمیم حیدر سید

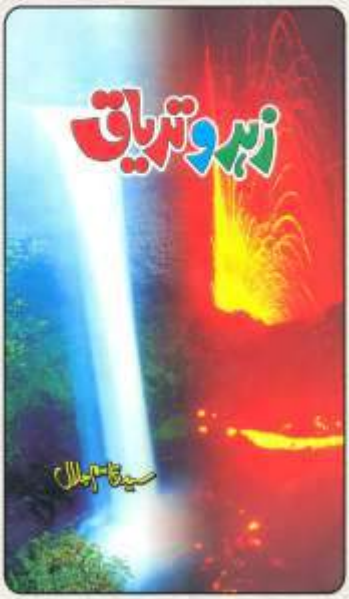
زہر و تریاق
سیدہ اسما جلال

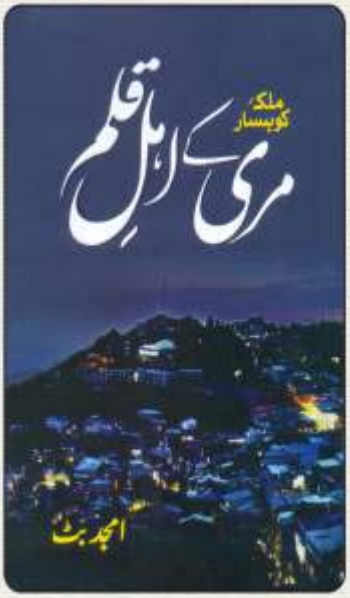
ملکۂ کوہسار
مری کے اہلِ قلم
امجد بٹ

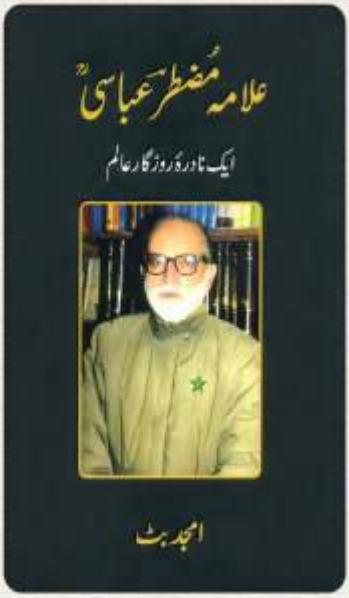
علامہ مُضطر عباسیؒ
ایک نادرۂ روزگار عالم
امجد بٹ

انا

سر پہ تھا آسمان تانبے کا
زیرِ پا تھی زمین لوہے کیا
اسپِ آتش نشان تانبے کا
نعل پیتل کے ، زین لوہے کا
زین پر تھی مشین لوہے کی
سیر کو سوئے شہر نکلی تھی
روند کر شہ نشین لوہے کی
بن کے پارے کی نہر نکلی تھی
نہر سے موجِ قہر نکلی تھی
لمحہ لمحہ دہائی دیتا تھا
زہر میں بجھ کے لہر نکلی تھی
شورِ محشر سنائی دیتا تھا
حشر کے گاؤں عمر بیت گئی
دھوپ کی چھاؤں عمر بیت گئی

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

Karachi: (021) 34541301-7 **Lahore:** (042) 36363300-7
Sialkot: (052) 3554301-6 **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
Faisalabad: (041) 8542924 **Peshawar:** (091) 5606565 **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ بیاض لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 32 - ستمبر 2024- شمارہ نمبر: 9

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: یومِ دفاع پاکستان

قیمت: 100 روپے

سالانہ زرِ اعانت 1000 روپے بیرون ملک $100 پاکستانی روپے میں

فیصل بینک لمیٹڈ

ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور

A/c Title Monthly BAYYAZ

اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

www.trackntie.com
BAYAZ
ویب سائٹ برائے مطالعہ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر اور پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر زد عمار ٹیکسٹائل اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَّأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	آصف ثاقب، خاور اعجاز	7 تا 8
2	نعت	ریاض مجید، آصف ثاقب، جلیل عالی، سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر، شریف ساجد، محمد یٰسین قمر، طالب انصاری، شاہ محمد سبطین شاہجہانی، افروز رضوی	9 تا 18
3	عقیدت	گلزار بخاری، اکرم ناصر، شاہ محمد سبطین شاہجہانی، ذکی طارق، مرزا آصف رسول	19 تا 23
4	رباعیات	گلزار بخاری، محمد نصیر زندہ	24 تا 25
5	قطعات	انعام الحق جاوید	26
6	مضامین	ابدال بیلا، خاور اعجاز، شبیر احمد قادری، ہارون رشید تبسم، اسلام عظمی، فرحت عباس شاہ، فیصل زمان چشتی، فیصل عرفان، منیر ابنِ رزمی، ظفر اقبال ظفر، صدام ساگر، فرح سنبل، کومل شہزادی، سید حامد سعید کاظمی، زاہد رشید	27 تا 87
7	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	88 تا 96

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
8	غزلیں	خالد احمد، محمد ارشاد، انور شعور، جلیل عالی، اعجاز کنور راجہ، باقی احمد پوری، خاور اعجاز، نسیم سحر، یعقوب پرواز، گلزار بخاری، سید ریاض حسین زیدی، محمد انیس انصاری، طارق بٹ، فرحت عباس شاہ، راحت سرحدی، مسعود احمد، شاہین عباس، شاہ محمد سبطین شاہجہانی، اکرم ناصر، عقیل رحمانی، اقبال سروبہ، ذکی طارق، شوکت محمود شوکت، محمد نوید مرزا، اشرف کمال، طلعت شبیر، ریاض ندیم نیازی، اجمل اعجاز، رضا اللہ حیدر، افتخار شوکت، ہمایوں پرویز شاہد، خالدہ انور، نائلہ راٹھور، علی حسین عابدی، اعجاز روشن، افروز رضوی، عابد معروف مغل، اکرم جاذب، نبیل احمد نبیل، میتھیو محسن، فیصل زمان چشتی، نعیم رضا بھٹی، غضنفر مہدی، قمر نیاز، سرور فرحان، مستحسن جامی، محمد اشفاق بیگ، ہارون رشید، صغیر احمد صغیر، سرفراز عارض، کوکل گل، محمد آصف انصاری، مظہر امام، روحا حاصل خلوص، سید ضیا حسین، بشیر احمد حبیب، اورنگزیب حسام حر، افضل ہزاروی، امر مہکی، قمر بشیر، عبدالرؤف زین، جیا قریشی، عطا العزیز، رجب علی رجب، محمد اکبر نیازی، امجد مرید حیدری، اخلاق آہن، عابد رضا، نادیہ سحر، اسد رضا سحر، نعمان محمود، قمر آسی	97 تا 168
9	طنز و مزاح / خاکے	اعجاز رضوی	169 تا 174
10	افسانے	حنیف باوا، ثمینہ سیّد، کلیم خارجی، اقبال خان یوسف زئی [صادق ہدایت: مترجم حمزہ حسن شیخ]، فصیحہ آصف خان، نوید عاکل	175 تا 217
11	نظمیں	سید انور ساجد، جلیل عالی، خاور اعجاز، نسیم سحر، خالد علیم، اسلام عظمی، طالب انصاری، احمد جلیل، ثمینہ سیّد، اکرم سحر فارانی، انصر حسن، محمد نوید مرزا، ظہور چوہان، اصغر علی بلوچ، امجد بابر، نائلہ راٹھور، ہارون رشید، عاصم بخاری، فرح اقبال، تسنیم کوثر، آسناتھ کنول، شائستہ رمضان، نوید صادق، اعجاز رضوی	218 تا 241

حمد

دھرتی سے آسمان سے ظاہر خدا کی شان
گویا بھرے جہان سے ظاہر خدا کی شان

ہم کو جو احترام تکلم عطا ہوا
اردو، سخن زبان سے ظاہر خدا کی شان

اس نے خدا کے حکم سے دہشت کو مات دی
اس فوج کے جوان سے ظاہر خدا کی شان

اونچا اڑا فلک پہ وہاں باز دیکھیے
اس کی جری اڑان سے ظاہر خدا کی شان

زخمی پرند خون سے تحریر لکھ گیا
ہر اک کڑی چٹان سے ظاہر خدا کی شان

لہجے کے دم سے پاؤں کی زنجیر کٹ گئی
کشمیر کی اذان سے ظاہر خدا کی شان

کس شان سے وطن کا یہ پرچم ہے سرخ رو
ملّت کے اس نشان سے ظاہر خدا کی شان

ثاقب تجھے بھی صبر کے احکام مل گئے
تیرے اس امتحان سے ظاہر خدا کی شان

آصف ثاقب

حمد

وہ پہلے تیرگی کے درمیاں آباد کرتا ہے
ہمارے گرد پھر اِک کہکشاں آباد کرتا ہے

کسی کے دل میں رکھتا ہے فقط دیدار کی حسرت
کسی کے ذہن میں حیرانیاں آباد کرتا ہے

بناتا ہے ہماری خاک سے جھرمٹ ستاروں کے
زمیں زادوں سے اپنا آسماں آباد کرتا ہے

ہمیں اِس لوحِ دُنیا سے مٹاتا ہے مگر پہلے
ہمارے واسطے تازہ جہاں آباد کرتا ہے

پھراتا ہے زمانے بھر میں ہم کو در بدر اور پھر
جہاں پر اُس کی مرضی ہو وہاں آباد کرتا ہے

بہت برباد کر کے کوچہ و بازارِ ہستی میں
وہ اَب کے دیکھیے ہم کو کہاں آباد کرتا ہے

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کچھ چھپایا نہ ہم نے دُنیا سے
عشق ہم نے کیا بھرے بازار

نعتؐ

احترام اپنے کو پہلے ہیں سکھایا کرتے
آپؐ کے شہر میں یوں ہی نہیں جایا کرتے

روشنی کرتی ہیں راتیں وہاں زائر کے لئے
سورج، اُس رہ کے مسافر پہ ہیں سایا کرتے

اُن کے روضے کو بھی راستہ جاتا ہے، یہ بات
راستے خود ہیں مسافر کو بتایا کرتے

یہاں اصحابؓ یہاں آلؓ رہا کرتی تھی
دَر و دیوار ہیں لوگوں کو بتایا کرتے

وہاں آداب ہیں کچھ اور خریداری کے
بھاؤ تاؤ میں نہیں وقت گنوایا کرتے

خود سراپا وہاں بَن جاتے ہیں کاسے کی مثال
لب نہیں آپؐ کی چوکھٹ پہ ہلایا کرتے

طیبہ حالوں کی امانت وہ بُوا کرتی ہیں
حیرتیں جتنی ہیں اُس شہر سے لایا کرتے

بات کم کرتے ہیں اُس قریۂ حیرت میں ریاض
وہاں چُپ رہ کے ہیں خیرات کمایا کرتے

ریاض مجید

نعتؐ

نظر ہر طرف روشنی آ گئی ہے
مدینے کی سوہنی گلی آ گئی ہے

ہر اک راستہ ہے سویرا سویرا
اجالوں کی ڈالی بھلی آ گئی ہے

لبوں پر رواں ہے محمدؐ محمدؐ
درودوں میں یادِ نبیؐ آ گئی ہے

شریعت عبادت طریقت کے صدقے
ہمیں بندگی ، زندگی آ گئی ہے

منافق سے بچنا تو مومن سے ملنا
ہمیں راستی ، دوستی آ گئی ہے

مدینے کی خوشبو یہاں بھی رکے گی
جو رستے میں اک جھونپڑی آ گئی ہے

لیا تھا محمدؐ کا نامِ گرامی
لبوں پر دعا مدھ بھری آ گئی ہے

نگاہوں میں اس کو بسانا ہے ثاقب
مدینے کی سندر جھڑی آ گئی ہے

آصف ثاقب

نعتؐ

خدا نے جو نعمتیں زمیں پر اتاریاں ہیں
اُس اک جمالِؐ جدا کے صدقے میں ساریاں ہیں

ہمیشہ اُس کے حبیبؐ کا واسطہ دیا ہے
خدا کے جب بھی حضور عرضیں گزاریاں ہیں

درود کرتا رہا ہوں دَم صبح و شام دل پر
اسی کی برکت سے سوچ فصلیں بہاریاں ہیں

شفاعتیں ہوں عطا پشیمانیوں کو آقاؐ
کہ گٹھڑیاں تو گناہ کی سخت بھاریاں ہیں

خرد سے آگے کا ہے یہ سرچشمۂ بصیرت
سرِ حرا جو جگی ہوئی بیقراریاں ہیں

برس رہی ہیں جو بن کے ابرِ کرم جہاں پر
اُسیؐ کے دردِ دروں کی سب اشکباریاں ہیں

وہ ایک پل، جب ادا کیا اُسؐ نے حرفِ اقرا
اُس ایک پل نے تمام صدیاں سنواریاں ہیں

فقط وہ سیرت کے نور سے دُور ہوں گی عالی
فلاح کے فلسفوں کی جو خامکاریاں ہیں

کہاں ہے ممدوحِ کبریاؐ کا مقام عالی
کہاں بچاری ہماری مدحت نگاریاں ہیں

جلیل عالی

نعتؐ

تشنگاں کی عید بن کر جام کوثر آگیا
ہم بھٹک جاتے بحمداللہ وہ رہبر آگیا

ناامیدی کے سرابوں میں بھٹکتی روح کو
خوش نصیبی! آپؐ کا اسوہ میسر آگیا

ہر زمانے میں خدا کی عظمتوں کے ذیل میں
تھے حوالے اور بھی ، اب سب سے بڑھ کر آگیا

حق پرستی کو بنانے حرز جاں انسان کی
سرپرست حق پرستی کا وہ پیکر آگیا

خالق و مخلوق میں جس نے بڑھائے رابطے
ہاتھ میں اپنے وسیلہ وہ موقر آگیا

کام آیا ہے ریاض بے غرض انسان کے
"نعت نذرانہ" میں نکتہ یہ منور آگیا

سید ریاض حسین زیدی

خالد احمد تری نسبت سے ہے خالد احمد
تو نے پاتال کی قسمت میں بھی رفعت لکھی

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

نعتؐ

عجیب نُور کا منظر تھا بر لبِ دریا
بڑھا تھا نعت کی محفل سے منصبِ دریا

ٹھہر ٹھہر کے مجھے داد دی تھی پانی نے
سُنائی نعتِ نبیؐ میں نے جب لبِ دریا

کُھلا تھا ذائقہ اِس میں بھی آبِ زم زم کا!
سو مجھ کو راس بہت آیا مَشرَبِ دریا

مجازی عشق کی یوں قلبِ ماہیت ہوئی تھی
کہ نعت سنتے ہی بدلا تھا مذہبِ دریا

حُسینیوں پہ کبھی پانی بند کرتے نہیں
سِکھا رہا تھا سبق ہم کو مکتبِ دریا

اُسی کی کر لیں جو تقلید ہم بھی، اچھا ہو!
وسیع تر ہے ہمیشہ سے مشربِ دریا

پڑھا جو صلِ علیٰ تو وہ راستے سے ہٹا!
وگرنہ کس کے تھا قابو میں اشہبِ دریا

سمجھ گیا، مِری نیّت مدینے جانے کی
اُدھر ہی لے کے چلا مُجھ کو مَرکَبِ دریا

جو اشک حُبِّ نبیؐ میں بہے تو مجھ پہ کُھلا
کہ چشمِ نم سے بھی ملتا ہے منصبِ دریا

وہ لہر لہر درود و سلام پڑھتا رہا
سمجھ سکا نہ مگر کوئی مطلبِ دریا

خدائے دہر، کہ جو ہے مُسَبِّبُ الاَسباب
اُسی کے حُکم نے کھولا مُسَبِّبِ دریا

میں نعت پڑھنے لگا جب وہاں نسیمِ سحر
فلک پہ وجد میں آیا تھا کوکبِ دریا

نسیمِ سحر

نعتؐ

ان کے حضور قلبِ تپاں شاداں ہوا
ہر ہر مقام دافعِ رنج وفغاں ہوا

کونین میں خوشی کا ہوا غلغلہ کہ جب
اعلانِ آمدِ ختم المرسلاں ہوا

تھا بد نصیب دولتِ ایمان سے گیا
اس رحمتِ تمام سے جو بد گماں ہوا

حیران و مستفید ہیں کفار آج بھی
ان کا نظام آج بھی رائج جہاں ہوا

حسنِ معاشرت کے فقط ایک لفظ میں
اسلام اور زمانہ مکمل بیاں ہوا

اٹھی نگاہ گردنیں عشاق کی جھکیں
نقشِ قدم بھی سجدہ گہِ دلبراں ہوا

ساجد مرا وظیفہ درود و سلام تھا
محشر میں میرے سر پہ یہی سائباں ہوا

شریف ساجد

نعتؐ

صورت ہی بدل جائے مرے طرزِ دعا کی
جب قلب سے آتی ہے صدا "صلِّ علیٰ" کی

اک جان سی پڑ جاتی ہے بے جان بدن میں
تاثیر عجب دیکھی ہے طیبہ کی ہوا کی

ممکن ہے کہاں حلقۂ ادراک میں آوے
عظمت جو ملی آپؐ کو "لولاکَ لَما" کی

اب سامنے قرآن ہے اور آپؐ کا اُسوہ
حاجت کہاں اب اور کسی راہ نُما کی

کیا شان ہے محبوبؐ دوعالم کے نگر کی
ہر ذرّے میں وسعت ہے جہاں ارض وسا کی

فیضان یہ سارا ہے اُسی ماہِ مبینؐ کا
دنیا میں ضیا جتنی ہے تسلیم و رضا کی

حقدار ہے رحمان کے وہ لطف و کرم کا
جس نے بھی مرے آقاؐ کی توصیف وثنا کی

"اقراء" کی لگن اور بھی بڑھ جائے ہے دل میں
یاد آتی ہے جس آن مجھے غارِ حرا کی

ہے دارِ کرم ، دارِ عطا کوئے پیمبر
بگڑی ہوئی بنتی ہے جہاں خلقِ خدا کی

ہو جاتی ہے انوار بداماں مری دنیا
جب بات کرے کوئی مدینے کی فضا کی

جس آن بھی قرآں کی تلاوت کریں اے دل
آتی ہے مہک خُلقِ رسولؐ دوسرا کی

مَس کرتا ہوں آنکھوں سے میں خاک دراطہر
ہوتی ہے طلب جب بھی مجھے خاک شفا کی

عثمانؓ و ابوبکرؓ و عمرؓ ، حیدرؓ کرّار
کرنیں ہیں قمر تا بہ ابد ، بدرؓ ہدیٰ کی

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

تو بیاں اوصاف ہوں گے آپ کے تفصیل سے
ساتھ دینے کو کہوں گا میں اگر جبریل سے

اور تو زادِ رہِ شہرِ نبی کچھ بھی نہ تھا
میں نے بس موتی نکالے آنکھ کی زنبیل سے

اک شبِ خوش بخت میں دیدارِ پیغمبر ہوا
اور مکمل ہو گیا میں خواب کی تکمیل سے

اس جمالِ نور پرور کا بیاں ممکن نہیں
یہ بتایا جا نہیں سکتا کسی تمثیل سے

ہوں طوافِ گوشۂ غارِ حرا میں منہمک
خصلتِ پروانہ سیکھی ہے اسی قندیل سے

اور سارے کام سرعت سے کیا کرتا ہوں میں
حقِ مدحت تو ادا ہوتا نہیں تعجیل سے

مجھ کو دہلیزِ نبی تک جانا ہے اب ننگے پاؤں
وہ نظر مینار آنے لگ گئے دو میل سے

کچھ نہیں طالب زرِ الفاظ و قرطاس و قلم
بیش قیمت ہوتا ہے یہ نعت کی تنزیل سے

طالب انصاری

نعتؐ

سایہ ہے میرے سر پہ مدینے کی میم کا
کیسا کرم ہوا ہے خدائے رحیم کا

آنکھوں میں جلوہ بار ہے بابِ نبیؐ کا حُسن
منظر ہے نقشِ دِل پہ ابھی تک حطیم کا ہے

گھر سے بھی دیکھ لیتا ہوں طیبہ کی رنگتیں
مجھ پر کرم ہے آج بھی میرے کریم کا

طیبہ سے آ رہی ہے معطر ہوائے لُطف
عنبر فشاں یہ جھونکا نہیں ہے شمیم کا

اُن کے کرم نے دل میں گلستاں کِھلا دیے
ممنون کب ہے دل مرا بادِ نسیم کا

میرا یقین ہے یہ رسولِؐ کریم ہی
ہر راز جانتے ہیں الف ، ل ، م کا

جیسے کوئی شریک نہیں رب کی ذات کا
ثانی نہیں ہوا کوئی ربّ کے وسیم کا

اُس دل پہ شانِ فخرِ رسُولاں عیاں ہوئی
اعجاز جس نے دیکھا تھا ماہِ دو نیم کا

اقصیٰ میں ایستادہ رہے جُملہ انبیاء
اقصیٰ نے دیکھا رُتبہ رسولِ عظیم کا

سبطین جب سے دیکھا ہے میں نے نبیؐ کا شہر
دل میں خیال تک نہیں خُلدِ نعیم کا

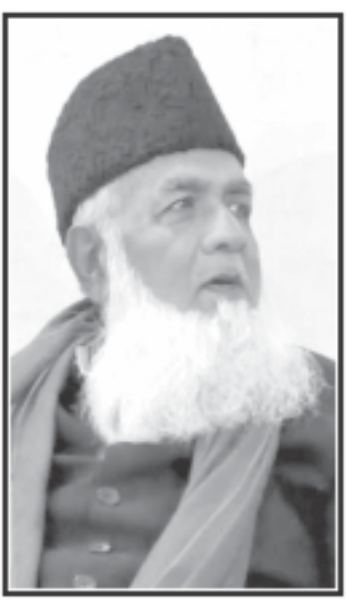

شاہ محمد سبطین شاہجانی

نعتؐ

یہی نہیں کہ فقط دل گزیدہ رکھتے ہیں
سدا یقین سے دامن دریدہ رکھتے ہیں

نبیؐ پاک، نبی آخر الزماں بھی ہیں
اس ایک بات پہ کامل عقیدہ رکھتے ہیں

حضور نظرِ کرم کیجیے غلاموں پر
لبوں پہ نعت کے ہم گل چنیدہ رکھتے ہیں

کوئی مثال نہیں ہے مرے نبی کی کہیں
کہ وہ صفات میں وصفِ حمیدہ رکھتے ہیں

اے کوفیو! کوئی ان سا نہیں زمانے میں
ہمیں ہے ناز، نبی برگزیدہ رکھتے ہیں

کمی نہ ان کی محبت میں کوئی ہو مجھ سے
یہی خیال مجھے آبدیدہ رکھتے ہیں

مٹا دیں خود کو نہیں غم ہمیں زمانے کا
کہ ان کے عشق میں ہم سر خمیدہ رکھتے ہیں

ہمیں انہی سے ہے الفت سو، اس لیے افروز
"بیاضِ دل میں انہی کا قصیدہ رکھتے ہیں"

افروز رضوی

عقیدت

ترا نام شب کے حصار میں ہے سحر کا باب بنا ہوا
یہی لازوال چراغ ہے مرا آفتاب بنا ہوا

تری آگہی نے جگا دیئے کئی بخت عالمِ خواب سے
تری معرفت کا نصاب ہے روِ انقلاب بنا ہوا

مرے آئینے کو سجا دیا ترے حسنِ جلوہ طراز نے
ترے خال و خد کا جمال ہے مری آب و تاب بنا ہوا

مرے ساتھ نکہت و رنگ کی جو بہار ہے ترا فیض ہے
تری آرزو کے چمن میں ہے مرا دل گلاب بنا ہوا

ترا شہر مجھ کو امان دے تو سکونِ قلب نصیب ہو
مرا شوق ہے تری راہ پر ہمہ اضطراب بنا ہوا

مجھے بارشوں کی طلب ہو کیوں کسی ابرِ تیرہ سرشت سے
مری چشمِ اشک فشاں میں ہے ترا غم سحاب بنا ہوا

یہ مسافتوں کی صعوبتیں مجھے ناامید کریں گی کیا
ترا رحمتوں کا خیال ہے مرا ہم رکاب بنا ہوا

مجھے کیا عدالتِ دہر سے کہ ترے شعور کی لہر سے
مرا نکتہ چیں ضمیر ہے مرا احتساب بنا ہوا

تری ہمرہی میں جو لے گیا ہمیں راہِ آبِ حیات پر
ترے قافلے سے بچھڑ کے ہے وہ سفر سراب بنا ہوا

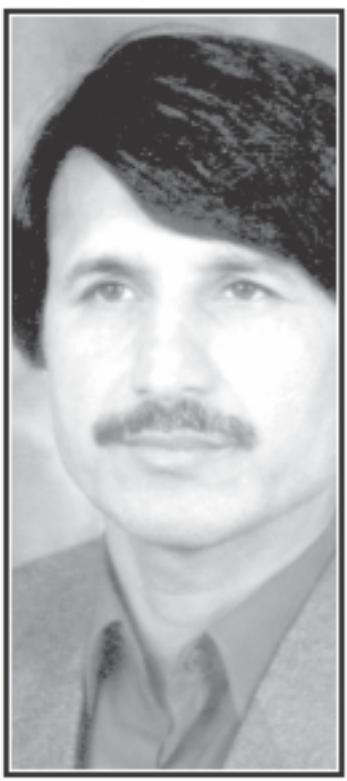

گلزار بخاری

عقیدت

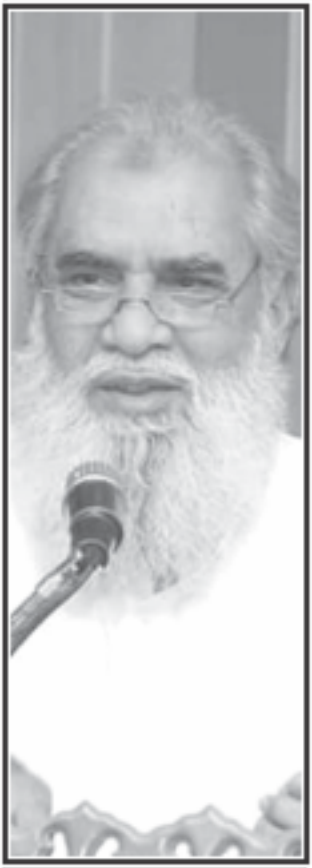

کوئی گلیوں میں لگاتا ہے صدا مانگتا ہے
کوئی مسجد میں ہے اور ہاتھ اٹھا مانگتا ہے

پوری ہونے میں کوئی شک نہیں رہتا جو بھی
واسطہ دے کے محمد کا دعا مانگتا ہے

مانگتے رہتے ہو ہر وقت خدا سے لیکن
یہ بھی سوچا ہے کہ کیا تم سے خدا مانگتا ہے

مجھ سے بڑھ کر یہاں میری ضرورت کی خبر
اس کو ہے علم کہ کیا میرا گدا مانگتا ہے

اے مرے مالک و مختار یہ بندۂ حقیر
کچھ نہیں مانگتا بس تیری رضا مانگتا ہے

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ عشق ہے ، کہ وسعتِ آفاقِ کربلا
یہ عقل ہے ، کہ گوشۂ دشتِ قیاس ہے

عرفانِ ذات

کتنی بلند ذات مرے پیشوا کی ہے
جن کی ہر اک ادا پہ نظر مصطفیٰؐ کی ہے

اُن کو خدا نے مالک و مختار کر دیا
یہ ساری کائنات مرے مصطفیٰؐ کی ہے

سیراب اشقیا ہوئے خود تشنہ لب رہے
کوئی مثال کب ترے جود و سخا کی ہے

قرآن پاک آپ نے نیزے پہ پڑھ دیا
کیا نسبتِ کمال شہِ کربلا کی ہے

ہر ہر نفس میں ذکرِ الٰہی ہے معجزن
یہ طرزِ حق شناس سبھی اولیا کی ہے

سبطین شاہجہانی تری ذات کچھ نہیں
یہ ساری آن شان ترے پیشوا کی ہے

شاہ محمد سبطین شاہجہانی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دامنِ چاک پھیل کر خالد
دامنِ التجا نہ ہو جائے

عقیدت

عدو کے دلوں پر حکومت کرو
سیاست کو آقا کی سنت کرو

بلاؤں نے آقا ہے گھیرا مجھے
نبی جانِ رحمت ہو رحمت کرو

یقیناً مدینہ دکھائے گا رب
نبی کے وسیلے سے منت کرو

خدارا دوعالم کے مختار سے
محبت محبت محبت کرو

سروں پر ہے مہرِ قیامت نبی
شفیع الامم ہو شفاعت کرو

نبی ، تشنۂ کربلا کے طفیل
مجھے جام کوثر عنایت کرو

مجھے یادِ طیبہ میں ہے ڈوبنا
کرو واعظو ذکرِ جنت کرو

درود و سلام آپؐ پر بھیج کر
حصولِ مفادات و برکت کرو

"ذکی" ڈوب کر عشقِ سرکار میں
بچی زندگی خوب صورت کرو

ذکی طارق

عقیدت

ہو باریاب حریمِ سخا میں صلِ علیٰ
کہ اُن کے در پہ ہو عرضِ گدا میں صلِ علیٰ

رہیں زبان و دل و جاں بہم دِگر نازاں
کہ ہمنوا ہیں سبھی ہم، نوا میں صلِ علیٰ

جہادِ حق جو ہے اب، صبر و استقامت کی
ادا وہ چاہیے ہو جس ادا میں صلِ علیٰ

جہاں تھا کرنا ہمیں وقف اپنا سارا وجود
فضا ہے نعروں کی بس اور فضا میں صلِ علیٰ

ہمارا ذکر ہے دھوکا، ہماری فکر فریب
ریا ہے ہم میں، ہمارے ریا میں صلِ علیٰ

انا تو صلِ وسلم میں گم نہ کر سکے ہم
ہے کھو دیا مگر اپنی انا میں صلِ علیٰ

ہے کہتی ہر جگہ لاتقنطوا پہ رحمتِ حق
رجا ہے صلِ علیٰ میں رجا میں صلِ علیٰ

سبھی مکارمِ اخلاق و دین و ایماں کا
ہے تکملہ وہ، ہے جس تکملہ میں صلِ علیٰ

خلوص و طاعت و عزم و یقیں کا ان پہ درود
ہے عفو و رحمت و صدق و صفا میں صلِ علیٰ

ہمیں نہ سن سکے آوازِ خیرِ کُل ورنہ
ہے لحہ لحہ صدا اور صدا میں صلِ علیٰ

ہیں پڑھتے صلِ وسلم توکل و تقویٰ
ہے ذکر و شکر میں، رُشد و ھدیٰ میں صلِ علیٰ

درودِ آلِ محمدؐ سے جان و دل میں سُرور
ہے کیف و وجد میں، حُبِ وہوا میں صلِ علیٰ

ہے اِس جہانِ فنا میں ہمارا کیا باقی؟
بس ایک عشق، ہے جس کی بقا میں صلِ علیٰ

فقیرِ شاہِ دو عالم ہے ہر کسی سے امیر
یہ فقر ہی تو غنا ہے، غنا میں صلِ علیٰ

ہیں وہ محمدؐ و احمدؐ، انہی سے حمدِ حمید
ہے جلوہ صفتِ کبریا میں صلِ علیٰ

ندائے نعت ہے تحدیثِ نعمت اور آصف
ندا سے ہے کہیں بڑھ کے ندا میں صلِ علیٰ

مرزا آصف رسول

رباعیات

گلزار بخاری

تاریخ ہے بندوں کی جہان خاکی
بندے جو زمینی بھی ہیں اور افلاکی
لاتا ہے ستم سامنے ہیرو شیما
کرتا ہے عیاں جبر کو ناگاساکی

ہے علم انھیں مشکل بھی ہے آسانی بھی
کرتے ہیں بسر ہنس کے پریشانی بھی
گھبرایا نہیں اگرچہ قیامت گزری
کس درجہ پُرامید ہیں جاپانی بھی

جیون میں بقا آس کو امکان تو ہے
آمادگی حاصل سروسامان کو ہے
انسان کو آسودگی دینے والا
ترجیح اگر ہے تو وہ جاپانی کو ہے

اسلام کا رشتہ ہے نہ ہے دینی بھائی
البتہ زمین سے ہیں زمینی بھائی
تلخی کو حلاوت میں بدل دیتے ہیں
میٹھے نہ لگیں کیوں ہمیں چینی بھائی

رباعیات

شب زاد غمِ نشاط کی شادی ہے
غم کاغذی پیرہن میں فریادی ہے
تم لوگ جو کر رہے ہو آزادی کی بات
وہ میری نظر میں قید آزادی ہے

سوچوں کی ہوا کو کھلی آزادی دو
آزادی کے پاؤں کو بھی آزادی دو
یہ منزلوں کے خواب کریں گے زنجیر
رستوں کو سوچنے کی آزادی دو

مے قرض کی خوب پی رہی ہیں قومیں
فردا کا کفن خود سی رہی ہیں قومیں
انسان آزادی کا سبق پڑھ رہے ہیں
مقبوضہ خودی میں جی رہی ہیں قومیں

گھر میرا ایک سرحدی گاؤں میں ہے
گاؤں کا ضمیر دھوپ کی چھاؤں میں ہے
کیسے ہو مرا سفر پرندوں جیسا
آزادی کی زنجیر مرے پاؤں میں ہے

سورج کی ہو کرن معطل کیسے
ڈالے کوئی روشنی میں بل کیسے
خوشبو نہیں ہوتی پھول کی مٹھی میں بند
آزادی کی روح ہے مقفل کیسے

گلزارِ قلم کی چھاؤں آزاد کرو
مزدور سخن کا گاؤں آزاد کرو
تدبیر سے کھولو نفرت کی زنجیر
تقدیر بشر کے پاؤں آزاد کرو

امید شکن مرگ تمنا وی ہے یہ
شب ناک نمو کی سحر ایجادی ہے یہ
پازیب ہے احساس جفا کی خاموش
جمہور فریب طوق آزادی ہے یہ

تقریر کو ہتھیار سے تعبیر کیا
الفاظ کو آئینۂ شمشیر کیا
آزادیٔ جمہور نے پہنی وردی
ہم نے سوچوں کو پا بہ زنجیر کیا

ہو زیر دام شعلۂ غل کیسے
وہ قید کریں نالۂ بلبل کیسے
آزادی کی ہواؤں میں حد کیسی
خوشبو ہو اسیر پنجۂ گل کیسے

محمد نصیر زندہ

قطعات

انعام الحق جاوید

وہ مشرق ہو کہ مغرب سب ممالک ایک جیسے ہیں
غلاموں کی کئی قسمیں ہیں مالک ایک جیسے ہیں
ہزاروں رنگ کے ہیں مذہبی دربار دُنیا میں
مریدانِ گرامی اور سالک ایک جیسے ہیں

آج کے دور میں اتنی کتنی باتیں سوچنے والی ہیں
گھر چیزوں سے بھرے ہوئے ہیں ذہن سکون سے خالی ہیں
ہم اس باغ کے مالک ہیں اور ہم ہی اس کے مالی ہیں
پھل حاصل کرنے کی خاطر پھر کیوں ہاتھ سوالی ہیں

عشق ایک ایسا لڑھکتا ہُوا پتھر ہے میاں
راستے میں جو کہیں پر بھی نہیں رُک سکتا
کیا کریں کھیل کا میدان ہی ڈھلوان پہ ہے
جس میں انسان ذرا سا بھی نہیں جھک سکتا

پنہاں ہے درس رات اور دن کے نظام میں
کوئی نہیں دلیل کہ جو اس کو ٹوک دے
ہو سکتی ہی نہیں کوئی اتنی طویل رات
جو آنے والی صبح کو آنے سے روک دے

آقاؐ کا شجرہ نسب

تمام انبیاءؑ اعلیٰ نسل سے ہوتے ہیں۔ نسلیں تو سب انسانوں کے باپ آدم علیہ السلام سے چلیں۔ اسی لڑی سے ادریس علیہ السلام آئے، پھر ان کے پوتے نوح علیہ السلام، انہی سے ہوتی ہوئی انبیاء علیہم السلام کی لڑی میں سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کا ظہور ہوا پھر ان کے فرزند سیّدنا اسماعیل علیہ السلام کی ساٹھویں پشت سے امام انبیاء آقا رسول آخرؐ کی آمد ہوئی۔

حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت اسماعیل علیہ السلام تک آئے لوگوں کے نام تاریخ میں قابل تسلیم حد تک درج نہیں۔ قیاس آرائیاں ہیں۔ قلم کی ایجاد بھی حضرت نوح علیہ السلام کے دادا حضرت ادریس علیہ السلام نے کی تھی، جنھیں خدا نے قلم سے لکھنا سکھایا۔ بہر حال سیّدنا اسماعیل علیہ السلام کی چالیسویں پشت سے "عدنان" ہوئے۔ جن کے بعد کی تمام نسلوں کے احوال تاریخ میں تفصیل سے لکھے ہوئے ہیں۔ انہی "عدنان" کی بیسویں پشت سے آقاؐ کی ولادت ہوئی۔

"عدنان" پہلے آدمی تھے جنھوں نے کعبہ کو چمڑے کا غلاف چڑھایا۔ عدنان، عدن سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں قیام کرنے والا۔ یہ چھٹی صدی قبل مسیح میں شاہ بابل اور عراق بخت نصر کے ہم عصر تھے۔ ان کی بیوی کا نام تھا مہدہ بنت الہم بن جلحب بن جدیس بن جاثر بن ارم۔

"معد" بن عدنان، بخت نصر کے دور میں بارہ سال کے کم عمر تھے۔ کہتے ہیں معد بھی وہیں تھے جدھر بخت نصر تباہی مچاتا فلسطین میں پھر رہا تھا۔ یہ ۵۸۶ قبل مسیح کی بات ہے۔ اس عہد کے نبی ارمیاء علیہ السلام کو اللہ نے وحی بھیجی کہ معد بن عدنان کو ہمراہ لے جا، وہ لے گئے۔ اللہ نے بتا دیا کہ ان کی پشت سے آخری نبیؐ پیدا ہونے ہیں۔ ارمیاء علیہ السلام عزت و آبرو سے معد کو لے کر شام اترے۔ بنی اسرائیل کے ساتھ نشو و نما پائی۔ وہیں "معانہ" بنت جوشن بن جابہ بن عمرو بن برۃ بن جرہم سے شادی کی۔ پھر جزیرہ نما عرب میں واپس چلے آئے۔

"نزار" معد کا بیٹا تھا۔ نزار کے معنی ہیں یگانہ روزگار۔ کہتے ہیں ان کی آنکھوں میں خاص چمک تھی جو پیدا ہوتے ہی ان کے والد معد کو نظر آ گئی کہ آخری رسول آقاؐ انہی کی نسل سے ہوں گے، اسی لیے یہ نام رکھا گیا۔ ان کی والدہ کا نام سودہ تھا۔ سودہ بنت

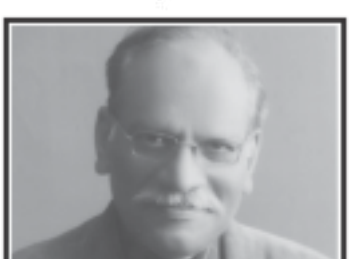

ابدال بیلا

عک بن اترہبت بن عدنان۔

"مضر" گورا چٹا خوبصورت نزار کا بیٹا تھا۔ مضر ہے بھی مضیرہ سے ماخوذ جو سفید اجلے دودھ کو کہتے ہیں۔ ان کی زوجہ کا نام رباب تھا۔ رباب بنت حیدۃ بن معد بن عدنان۔

"الیاس" کے معنی بھی بہادر اور شجاع ہیں، تھے بھی وہ ایسے ہی، بنو اسماعیل کو اسماعیل علیہ السلام کے جی دار طریقے پہ کاربند کیا۔ تیراندازی کے ساتھ حکمت اور دانائی سکھائی۔ الیاس بن مضر کی والدہ "رباب" ہی تھیں اور ان کی بیوی کا نام لیلیٰ تھا۔ لیلیٰ کو خندف بھی کہا جاتا تھا۔ لیلیٰ بنت حلوان بن عمران بن الحاف بن قضاء یہی الیاس کے بیٹے مدرکہ کی ماں تھیں۔

"مدرکہ" کا اصلی نام عمرو تھا۔ ایک سفر میں انھوں نے جنگلی خرگوش سے ڈر کے بھاگتے ہوئے اونٹ پالیے۔ "پالینے والے" کو مدرکہ کہا جاتا تھا۔ یوں ان کا نام عمرو کی بجائے مدرکہ ہوگیا۔ ان کی بیوی کا نام "سلمیٰ" بنت اسلم بن الحاف بن قضاء تھا۔ یہی مدرکہ کے بیٹے خزیمہ کی ماں تھیں۔

"خزیمہ" خزمہ کی تصغیر ہے، جو کھجور جیسے اس چھوٹے درخت کو کہتے ہیں جس کے پتوں سے ٹوکریاں بنتی ہیں۔ اعلیٰ اخلاقی قدروں والے خزیمہ بن مدرکہ دین ابراہیم علیہ السلام پہ قائم تھے۔ ان کے بیٹے "کنانہ" کی والدہ عوانہ تھیں۔ ہند بھی انہی کا نام تھا، بنت سعد بن قیس بن عیلان۔

"کنانہ" تیروں بھرے ترکش کو کہتے ہیں۔ اپنی قوم کے لیے وہ امن کی ضمانت تھے۔ بہادر، قوی، معزز اور علم و گیان والے۔ کہتے ہیں انھیں ایک بار خواب میں پوچھا گیا کہ ان میں سے کیا چاہتے؟

جاہ و حشم

عمارات یا

مال و متاع

انہوں نے خواب ہی میں جواب دیا۔

یہ ساری چیزیں۔

کہتے ہیں، یوں یہ سب نعمتیں قریش کو ودیعت ہوئیں۔ کنانہ بن خزیمہ کے بیٹے نضر کی ماں "برہ" تھیں۔ برہ بنت مرہ بن اد بن طابخہ۔

"نضر" کا چہرہ بہت تابناک اور تروتازہ تھا۔ کہتے ہیں، ان کا چہرہ دیکھ کے ہی ان کا نام رکھا گیا۔ کہا جاتا ہے انھی کا لقب "قریش" تھا۔ نضر کے بیٹے مالک کی ماں کا نام عاتکہ تھا جو عکرشہ بھی کہلاتی تھیں۔ بنت عدوان، جنہیں حارث بھی کہا جاتا تھا، بن عمرو بن قیس بن عیلان بن مضر۔

"مالک" کی کنیت ابو حارث تھی۔ ان کا ایک قول مشہور ہے۔

"خوبصورت چہرے عیبوں کو چھپا لیتے ہیں۔ جب ان کے عیب ظاہر ہو جائیں تو پھر ان کی صورت پہ نہ جاؤ۔"

مالک کے بیٹے "فہر" کی ماں جندلہ تھیں۔ بنت عامر بن حارث بن مضاض بن زید بن مالک جو جرہم قبیلے سے تھے۔

"فہر" ہتھیلی برابر پتھر کو کہتے ہیں۔ کنیت ابو غالب تھی۔ ایک قول یہ ہے کہ فہر کا لقب قریش تھا۔ بعض

کہتے ہیں ان کی ماں جندلہ نے ان کا نام ہی قریش رکھا تھا، کیونکہ ماں کو قرش سمندر کی بڑی مچھلی، جسے ہم وہیل کہتے ہیں بہت پسند تھی۔ یوں اپنے بیٹے میں قوت، طاقت اور رعب، دبدبا قائم رکھنے کے لیے جندلہ نے اسے یہ نام دیا۔

"غالب" کے دوسرے بیٹے تیم الادرم کی نسبت سے ان کی کنیت ابو تیم تھی۔ ایک جبڑا ناقص ہونے کی وجہ سے تیم کو الادرم کہا جاتا تھا۔ کہتے ہیں غالب بن فہر کاہن بھی تھے۔

ان کے بیٹے "لوی" کی ماں عاتکہ بنت یخلد بن النضر بن کنانہ تھیں۔

"لوی" لواء یعنی پرچم سے ماخوذ ہے۔ یہ بڑے علم پرور اور جہاں دیدہ شخص تھے۔ حکمت اور بصیرت والے۔ ان کے یہ اقوال مشہور ہیں۔

"جس نے ہمیشہ نیکی کی، اس کی نیکی کبھی ختم نہ ہوگی۔
مسلسل اس کا تذکرہ ہوتا رہے گا۔

لازم یہ ہے کہ
جس پر نیکی کی جائے وہ یہ تذکرہ کرے
اور جس نے نیکی کی ہو وہ چپ رہے
وہ اپنی نیکی کا چرچا نہ کرے۔"

لوی بن غالب کے بیٹے "کعب" کی ماں "ماویہ" بنت کعب بن القیس جنھیں نعمان بھی کہتے تھے، بن جسر بن شیع اللہ بن اسد بن وبرہ بن تغلب بن حلوان بن عمران بن الحاف بن قضاعہ تھیں۔

"کعب" اونچے ٹخنے اور بلند قدم والے کو کہتے تھے۔ کعب بن لوی اپنے عہد کے بہت معزز آدمی تھے۔ شرف و عزت اس قدر زیادہ کہ ان کی وفات کے بعد سالوں کا تعین ان کے نام سے ہونے لگا۔

وہ عرب کا کیلنڈر بن گئے۔

یہ سلسلہ عام الفیل تک جاری رہا۔ کہا جاتا ہے کہ یوم عروبہ کا نام بدل کے "یوم جمعہ" انھوں نے رکھا تھا۔ کنیت ان کی ابو ہصیص تھی۔ ان کا زمانہ آقا سے ۵۶۰ سال پہلے کا ہے۔ وہ خطبہ دیتے تو آغاز "اما بعد" سے کرتے۔ یہی پھر رائج ہو گیا۔ ان کے بیٹے "عدی" سیدنا عمر بن خطابؓ کے جد امجد تھے۔

کعب کے بیٹے "مرہ" کی ماں فخشیہ تھیں۔ جو بیٹی تھیں شیبان بن محارب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ۔

"مرہ" بیک وقت طاقت ور اور تلخ مزاج دونوں کے لیے استعمال کیا جانے والا لفظ ہے۔ مرہ بن کعب کی کنیت ابو یقظہ تھی۔ ان کے بیٹے "تیم" سیدنا ابو بکرؓ اور سیدنا طلحہؓ کے جد امجد تھے۔ انھی کے بڑے بیٹے یقظہ کی نسل سے بنو مخزوم تھے، جس نسل سے ابو جہل تھا۔ مرہ بن کعب کے بیٹے کلاب کی ماں ہندہ تھی۔ ہندہ بنت سریر بن ثعلبہ بن الحارث بن مالک بن کنانہ بن خزیمہ۔

"کلاب" شکار کے شوقین تھے۔ کلاب بن مرہ نے کتے پالے ہوئے تھے شکاری۔ ابن مرہ کا نام لوگ بھول گئے، کلاب کے نام ہی سے مشہور ہو گئے۔ ان کی کنیت ان کے بڑے بیٹے زہرہ کے نام سے "ابو زہرہ" تھی۔ یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے سونے کی دو تلواریں خانہ خدا کے اندر سجائیں۔ انھی کے نامور دوسرے بیٹے کا نام تھا، قصی۔

☆☆☆☆☆

''تندیِ بادِ مخالف.....'' والے شاعر کے دیگر کلام کا جائزہ

سید صادق حسین شاہ صادقؔ کاظمی (کھاوڑ پاڑہ، کشمیر یکم اکتوبر ۱۸۹۸ - ۴ مئی ۱۹۸۹ اسلام آباد) خاندان کے ہمراہ ہجرت کر کے ۱۹۱۰ میں ظفروال ضلع سیالکوٹ میں آباد ہُوئے - تعلیم بی اے ایل ایل بی-۱۹۱۹ میں اسلامیہ ہائی اسکول، جھنگ مگھیانہ میں مدرس تعینات ہُوئے - بعد ازاں انھیں کی کوششوں سے شکر گڑھ میں کالج کا قیام عمل میں آیا-۱۹۲۹ میں شکر گڑھ میں گرداور اور قانون گو کی حیثیت سے قانون کے پیشہ سے منسلک ہُوئے- ذہین آدمی تھے اور اردو، پنجابی اور فارسی عربی کے ہمراہ کشمیری اور انگریزی زبان پر بھی دسترس رکھتے تھے- یادداشت بہت اچھی اور مطالعہ بہت وسیع تھا- کتابوں کے سنِ اشاعت اور ناشرین کے نام تک اُنھیں یاد ہوتے تھے- گوشہ نشینی اور درویشی نے اُن کو وہ شہرت حاصل نہ ہونے دی جو اُن کا حصہ تھی-وہ عملی سیاست سے بھی وابستہ رہے- شکر گڑھ میں مسلم لیگ کا قیام انھی کا مرہونِ منت ہے- وہ اس علاقہ میں ۱۹۳۶ سے ۱۹۴۰ تک مسلم لیگ کے صدر رہے-اسلام آباد کے مرکزی قبرستان میں مدفون ہیں-

''برگِ سبز'' صادق حسین صادقؔ کی کلیات ہے- منظومات اور غزلیات کے علاوہ چند تراجم بھی اِس میں شامل ہیں جن میں سماجی اور اخلاقی مضامین کو فلسفیانہ اور ناصحانہ انداز میں رقم کیا گیا ہے- صادقؔ ایک بلند کردار عاشقِ رسولؐ تھے اور حق وصداقت کے لیے قلندرانہ جذبہ رکھتے تھے- نظریۂ پاکستان اور اسلامی اقدار اُن کی اولین ترجیحات رہیں- تحریکِ آزادی میں بھرپور حصہ لینے کے علاوہ قیامِ پاکستان کے بعد قرآن وسنت کی روشنی میں اِس سرزمینِ خداداد کو ہمیشہ پھولتا پھلتا دیکھنے کے خواہشمند رہے-

خاور اعجاز

اُن کی شاعری بنیادی طور پر جذبے کی سچائی اور متوازن فکر کی مظہر ہے بالخصوص اُن کی نعت محبت اور خلوص کے عناصر سے مہکتی ہے۔ وہ حالی، اقبال اور ظفر علی خان کے اسلوب کو پسند کرتے تھے اور انھیں کی طرز پر لکھنے کو ترجیح دیتے تھے۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی لکھا جو محفوظ نہ رہ سکا۔

اُن کے شعری مجموعہ "ہتگ سبز" کی ابتدا "دعائے مقبول" سے ہوتی ہے جو قرآنی آیات کے ترجمہ پر مشتمل ہے:

خداوندِ جہاں تیرے لیے تعریف ہے ساری
کہ ہے لطف و کرم تیرا ہر انس و جان پر جاری

.....

"صحرا کا نبیؐ" اس مجموعہ کی دُوسری تصنیف ہے جو میں وہ نبیؐ اکرم کی ولادت سے پیشتر ملکِ عرب کے دگرگوں حالات بیان کر کے کہتے ہیں کہ تند خُو، سفاک، ظالم اور جاہل عربوں میں حضرت عبداللہ جیسے نیک سیرت اللہ کے بندے کے ہاں حضرت محمدؐ جیسی پاکباز ہستی کی پیدائش کسی معجزے سے کم نہ تھی۔ اِس تمثیل نما نظم میں وہ نبیؐ پاک کی زندگی کے مختلف ادوار کا تذکرہ کر کے آخر میں کہتے ہیں کہ:

نبیؐ کے نام لیوا آج سب ملکوں میں بستے ہیں
متاعِ زندگی جو آپؐ پر قربان کرتے ہیں

تیسری نظم "نغمۂ اسلام" ہے جو انگریزوں اور ہندوؤں کی مشترکہ سازشوں کا راز فاش کرتی ہے اور قیامِ پاکستان کے عزم پر منتج ہوتی ہے:

راہِ حق میں ہم لٹا دیں گے جو اپنے پاس ہے
اور ہر قیمت پہ پاکستاں بنایا جائے گا

اگلی منظومات میں شیرِ دکن، حادثۂ جلیانوالہ باغ، قائدِ اعظم کے حضور میں، خطاب بہ مسلم جیسے عنوانات کے تحت شاعری کی ہے۔ "شیرِ دکن" کو مخاطب کرتے ہُوئے کہتے ہیں:

لرزہ بر اندام اعدا ہیں تری تقریر سے
تُو نے مُردوں کو جگایا نعرۂ تکبیر سے

.....

کفر کا سیلاب خود سوئے فنا بہہ جائے گا
نام زندہ رہتی دُنیا تک ترا رہ جائے گا

.....

جلیانوالہ باغ کے حادثہ پر اُن کے چند مصرعوں کی نظم بہت کچھ کہہ رہی ہے۔ نظم "قائدِ اعظم کے حضور میں" وہ دست بہ دعا ہیں کہ پاکستان رہتی دُنیا تک قائد کے فیض کا مظہر بن کر رہے۔ "خطاب بہ مسلم" میں مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ بے نشاں اور سنگِ آستاں بن کر جینا موت

سے بدتر ہے:

نہیں ہے خاکساری میں مزا کچھ زندگانی کا
جہاں سے کوچ کر یارہ حریفِ آسماں ہو کر

.....

"ایک ہندو کے حلقہ بگوشِ اسلام ہونے پر" میں اپنی طمانیت کا اظہار کرتے ہیں جب کہ "یادِ کشمیر" اور "خاکِ جھنگ" جیسی نظموں میں وہ اپنی زندگی کے اُن دنوں کو یاد کرتے ہیں جو وہاں کٹے۔ "رفیقۂ حیات کے نام" عنوان نظم کی معروضات بیان کرنے کے لیے کافی ہے۔ "بسترِ علالت پر" وہ عزیز و اقارب کی محبتوں اور نوازشوں کو یاد کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے بخشش کے طلبگار ہیں:

مَیں راضی ہُوں مولا رضا پر تری
اِسی میں ہے مضمر بری بہتری

.....

"لطفِ خلوت" ایک درویش کی زبانی دُنیا کے بندتوڑ کے خالق سے ناطہ جوڑنے میں مسرت و طمانیت کی خوشخبری سناتی ہُوئی نظم ہے۔ اس کے بعد کی نظمیں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے واقعات پر مشتمل ہیں مثلاً موت کے حوالے سے کہتے ہیں:

اِک نئی دُنیا کا تیرے واسطے پیغام ہُوں
مَیں نویدِ صبح لائی ہُوں اگرچہ شام ہُوں

"امتحان کا ہال" اخبارِ تعلیم لاہور میں شائع ہونے والی نظم ہے اور اپنے عنوان کی رعایت سے ہی مضامین کا بار اُٹھائے ہُوئے ہے۔ "سیاہ فام" ایک کالے رنگ والے ہونہار طالبِ علم کی حمایت میں لکھی گئی ہے۔ "درسِ عمل" میں کہتے ہیں:

یہاں کام ہے تیغ و تیر و سناں کا
یہ میداں ہے بس کوششِ جاوداں کا

"ابتدائے عشق" اُن کی حیات کے بعض لطیف اور رومانی گوشوں سے تعارف کراتی ہے:

دیکھ کر اِک نازنینِ مہ لقا
دل کا عالم اور ہی کچھ ہو گیا

.....

"اے ابرِ خوشگوار" میں وہ مہربان بارش والے بادلوں کا خیر مقدم کرتے نظر آتے ہیں:

تُو نے نظرِ کرم کی اِدھر ایک آن کی
پیری میں گویا پھر سے زلیخا جوان کی

.....

"آئینہ" غزل نما نظم ہے:

تُو بھی اے صادقؔ! صداقت رکھ سدا اپنا شعار
عیب و خوبی صاف کر دیتا ہے خوگر آئینہ

.....

نظم "انقلاب" اس لفظ کو باعثِ عبرت ٹھہراتی ہے۔ اُنھوں نے کچھ غزلیات بھی کہیں جن سے منتخب اشعار درج ذیل ہیں:

اے مسیحا ! نہ مکرر مجھے زندہ کرنا
کم نہیں موت سے منت کشِ احساں ہونا

.....

رکھ نشاں قائم کہ ہو جائے گا پھر پیدا اثر
پھر بھڑک اُٹھتی ہے آتش ہوں اگر باقی شرار

.....

محبت میں خموشی شرط ہے اے صادقؔ ناداں
سرگرمِ فغاں ہے کس لیے اندوہ گیں ہو کر

.....

تلاشِ رفتگاں بے سود صادقؔ
نہیں ملتے ہیں گم ہو کر یہ گوہر

.....

مستعد ہو کر نئے گلشن کی پھر تعمیر کر
دہر میں جو راخزاں کے ہاتھ سے نالاں نہ ہو
رفعتِ افلاک لے جائے تجھے افلاک پر
خواہشاتِ نفس سے آلودہ گر داماں نہ ہو

.....

آئے ہیں چارہ گر تو کریں شوق سے علاج
قسمت میں جو لکھا ہے وہ کیونکر مٹائیں گے

.....

یہ تمام اشعار صادق حسین صادقؔ کے زمانہ کی روایت کے مطابق ہیں جن میں کوئی انفرادی پہلو نمایاں نہیں تاہم اُن کی مندرجہ ذیل غزل اپنے ایک شعر کے حوالے سے ہمیشہ یاد رکھی جائے گی:

تُو سمجھتا ہے حوادث ہیں ستانے کے لیے
یہ ہُوا کرتے ہیں ظاہر آزمانے کے لیے

کامیابی کی ہُوا کرتی ہے ناکامی دلیل
رنج آتے ہیں تجھے راحت دِلانے کے لیے

آتشِ نمرود گر بھڑکی تو کچھ پروا نہیں
وقت ہے شانِ براہیمی دکھانے کے لیے

مانگنا کیسا ؟ کہ تُو خود مالک و مختار ہے
ہاتھ پھیلاتا ہے کیوں اپنے خزانے کے لیے

دست و پا رکھتے ہیں تو بیکار کیوں بیٹھے رہیں
ہم اُٹھیں گے اپنی قسمت کو بنانے کے لیے

.....

یہ غزل روزنامہ "آفتاب" لاہور میں 1918 میں شائع ہُوئی اور اپنے اس زباں زدِ عام شعر کی وجہ سے ذہنوں میں سما گئی:

تندیِ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب !
یہ تو چلتی ہے تجھے اُونچا اُڑانے کے لیے

.....

اگر یہ شعر علامہ اقبال کے اسلوب کا ترجمان ہو کر خاص و عام میں مقبول نہ ہو گیا ہوتا تو آج کوئی صادق حسین صادقؔ کے نام سے بھی واقف نہ ہوتا۔

☆☆☆☆☆

''پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدہ نگاری'': ایک تعارف

اپنے پرشکوہ اور رنگین اسلوب کی بدولت قصیدہ کا شمار مشکل اصنافِ سخن میں ہوتا ہے۔ قصیدہ دراصل ایک آزمائش کا درجہ رکھتا ہے جس پر ہر شاعر پورا نہیں اتر سکتا۔ مبالغہ قصیدے کی شان اور شناخت ہے۔ انتہای مبالغہ جھوٹ اور خودفریبی کی آخری حدوں کو چھونے لگتا ہے ۔ شاعر ایسے اوصاف و کمالات بیان کرتا ہے جو ممدوح میں سرے سے ہوتے ہی نہیں سرسید احمد خان بجا طور پر اسے خوشامد کا نام دیتے ہیں وہ شعرا جو مبالغہ اور غلو کو پسند نہیں کرتے وہ قصیدہ نویسی سے گریزاں ہی رہے۔ یہی صورت حسن طلب کی ہے۔ قصیدہ نگار اپنے ممدوح سے وہ کچھ مانگتا ہے کہ بادشاہ ہوتے ہوئے بھی وہ اس کے مطالبات من و عن پورے نہیں کر پاتا یا دینے کا اہل ہی نہیں ہوتا۔ سو قصیدہ اگر اس ذات والا صفات کی شان میں لکھا جائے جو عطا ہی عطا ہے یعنی وہ ایسا معطی ہے جو بن مانگے بھی عطا کرتا ہے۔ غنی ایسا کہ وہ خود کسی کا محتاج نہیں سب اسی کے محتاج ہیں۔ اسی کی بندگی کرتے اور اسی سے مدد مانگتے ہیں۔ جہاں تک مدح کا تعلق ہے مادح جتنی چاہے مدح سرائی کرے۔ مبالغے اور غلو کی کوئی صورت ہی سامنے نہیں آتی۔ اللہ پاک کی ذات و صفات اور کمالات کے بیان میں مبالغہ ہو ہی نہیں سکتا۔ شاعر جو کہے 'جو لکھے' 'جتنا لکھے' مدح ہی مدح ہوگی۔ مبالغہ اور غلو تو دنیاوی پیمانے ہیں۔ بارگاہ اقدس ان سے بے نیاز اور مستغنی ہے۔ اس کی شان میں تمہید بھی تحمید کا درجہ رکھتی ہے اور تمہید (Preamble) دیار مدح کا در کھولنے کے برابر ہے۔ یعنی حمدیہ قصیدہ لکھتے ہوئے تشبیب نسیب نہیں نصیب بن جاتی ہے۔ یہاں بھی شاعر اپنے قلم کی پیشانی خالق کائنات جل شانہ کی رحمتوں کی سردل پہ جھکا دیتا ہے گویا شاعر کے ساتھ اس کا قلم بھی

شبیر احمد قادری

بحضور حق تعالیٰ جھک کر اس کی ثنا کرتا ہے۔ قرطاس یہاں قرطاس نہیں، صف بن جاتا ہے۔ جہاں شاعر قلم سجدے کرتا اور ایمان و ایقان کی تازگی کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ لطیف پہلو یہ ہے کہ قصیدہ تو مقطع آشنا ہو جاتا ہے۔ مگر مادح کا سر صف قرطاس پر ہی جھکا رہتا ہے۔ ایسا ہونا بھی چاہیے کہ اس کی مدح وثنا کا عمل شاعری سے ہٹ کر کوئی اور ہی شے ہے۔ بے ریا عبادت کا کوئی قصیدہ ہوتا اور نہ مطلع مقطع۔ نہ تشبیب، نہ گریز کا پہلو بس مدح ہی مدح اور طلب ہی طلب جو مسلسل ریاضت و عبادت کے نتیجے میں ایک خاص سطح پر پہنچ کر حسن طلب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ جہاں سوال، زبان اور لبوں کی جنبش و حرکت سے بے نیاز ہو جاتا ہے، جہاں تک دعا کا تعلق ہے اس بارگاہ میں دعا دی نہیں جاتی مانگی جاتی ہے اور اس کی شان میں ہر وقت سر نیاز جھکا رہتا ہے۔ مدح کاری کا سلسلہ ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آتا اور حق مدح بھی ادا نہیں ہوتا' ہو ہی نہیں سکتا۔ سورہ الکہف کی آیت 109 میں خالق کائنات نے فرمایا ہے تم فرما دو: ''اگر سمندر میرے رب کی باتوں کے لیے سیاہ سیاہی ہو تو ضرور سمندر ختم ہو جائے گا اور میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوں گی اگرچہ ہم ویسا اور اس کی مدد کو لے آئیں۔'' اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے صدر الافاضل مولانا محمد نعیم الدین مراد آبادی لکھتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت کے کلمات لکھے جائیں اور ان کے لیے سمندروں کا پانی سیاہی بنا دیا جائے اور تمام خلق لکھے تو وہ کلمات ختم نہ ہوں اور یہ تمام پانی ختم ہو جائے اور اتنا ہی اور بھی ختم ہو جائے (خزائن العرفان فی تفسیر القرآن، صفحہ 548)، اسی طرح سورہ الحمد کے سارے مضمون حمدیہ ہیں۔ تعریف و ثنا 'مالک یوم الدین ہونے کا اعلان' اسی ذات کی پرستش کرنے اور اسی سے مدد مانگنے اور کل عالمین کا رب ہونے کا اعلان 'احکام کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے اسی ذات کے حضور التماس کے پھول پیش کیے جاتے ہیں 'وہی سیدھا راستہ دکھائے' مغضوبین کے بجائے انعام یافتہ اور نوازے گئے لوگوں کا راستہ۔ قصیدہ نگار بھی اللہ تعالیٰ کی ثنا کے بعد اسی نوع کی دعا سے اپنی تخلیقات کو مزین اور آراستہ کرتے ہیں۔ عباس علی شاہ ثاقب نے اس کتاب (پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدہ نگاری) میں قصیدے کے اسرار و رموز اور موضوعات کے بارے میں قارئین کی بہت کچھ رہنمائی کر دی ہے۔ ابتدا میں اس نوع کی باتوں کو زیر بحث لانا بہت ضروری تھا اس سے

پڑھنے والوں کو ایک تو مصنف کے ذاتی میلانات کا علم ہوتا ہے، دوسرا پڑھنے والوں کے ذوق کی تشفی بھی ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر قصیدے کے بنیادی مباحث اردو قصیدے کی روایت' اردو حمدیہ قصیدہ قیام پاکستان سے 1975 تک میں بہت اہم نکات بیان کر دیئے گئے ہیں۔ تقدیسی شاعری کے باب میں تحریک پاکستان کے لیے حصول آزادی کے لیے جوش اور ولولہ اور قیام پاکستان کے بعد کھلتے اور مسرتوں سے ٹمٹماتے چہروں پر اس وقت مردنی چھانے لگی اور گہری اداسی نے بے پایاں خوشیوں کے چہروں کو دکھ اور افسوس کی ختم نہ ہونے والی جھریوں میں بدل دیا۔ وہ نشان چہروں پر نہیں اہل وطن کے دلوں پر لگے تھے۔ نو آزاد مملکت کو درپیش گوناگوں مالی اور انتظامی مسائل' مہاجرین کی آبادکاری اور حکمرانوں کے ناروا فیصلوں' غلط بخشیوں نے اداسی اور دکھ کے نشانات کو اور بھی نمایاں کر دیا وہ لوگ بڑی سرعت سے حکومتوں کا حصہ بننے لگے جو سرے سے شریک سفر ہی نہ تھے۔ ان طالع آزماؤں نے قومی مفادات کو ذاتی اور وقتی مفادات کی خاطر قربان کرنا شروع کر دیا۔ ماحول کی تاریکی کو دور کرنے کے لیے روشن کیے گئے چراغ کو سر شام ہی بجھا دینے کی منصوبہ بندی کر لی گئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سفید غاصبوں کے قبضے سے آزاد کرائے جانے والے ملک پر کالے انگریز چھا گئے جنھیں دینی اقدار سے کچھ غرض تھی نہ ملکی ترقی کے کاموں سے' وہ محض اپنے پیٹ کی تجوریاں بھرنے کی نیت سے آئے تھے' دہائیاں گزر گئیں وہ تجوریاں بھرنے ہی میں نہیں آتیں اور ھل من مزید کی صدائیں بلند تر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ دوسری جانب شریف النفس، دیانت دار اور محب وطن افراد بے بسی سے ان ظالموں کی بے برکت حرکات کو دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ احتجاج اور مزاحمت کے رنگ تو سماج میں موجود ہیں مگر ان کی لے تیز تر نہیں ہو پائی اس لیے کہ ان بے چاروں کو گھر کا چولھا جلانے کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ عوام تو جیسے تیسے اپنا اچھا برا وقت گزار رہے ہیں مگر ارباب فکر وفن نے جملہ ادبی اصناف میں مزاحمت کے کہیں مدھم اور کہیں نظر خیرہ کن رنگ بھر دیے ہیں۔ نعت نگاروں نے استغاثہ و استعانت کا قرینہ اپنایا تو حمد نویسوں نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے ساتھ ساتھ بحضور حق تعالیٰ اپنی ذات، قوم اور ملت کو درپیش گوناگوں مسائل بیان کرنے کے لیے مناجاتی لہجہ اپنا لیا، کہیں کہیں تو حمد ہی میں مناجات کا یہ زاویہ نمایاں ہونے لگا۔ عباس علی شاہ ثاقب نے

پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدوں کے حوالے سے بہت اہم اور قابل تحسین کام کیا ہے۔ اپنے اس تحقیقی کام کو انھوں نے درج ذیل ابواب میں تقسیم کیا ہے:

- قصیدہ: بنیادی مباحث
- اردو میں قصیدے کی روایت
- اردو حمدیہ قصیدہ قیام پاکستان سے 1975 تک،
- اردو حمدیہ قصیدہ 1975 تا 2000 ،
- اردو حمدیہ قصیدہ 2022 تک،
- پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدہ نگاری معاصر صورت حال،

باب اول کی نوعیت تمہیدی ہے جس میں مصنف نے شعر و ادب بالخصوص قصیدہ نگاری کی جانب اپنی رغبت و تشویق کے بارے میں بتایا ہے۔ حمدیہ قصیدے ان کی رائے میں اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات کی قدرتوں، عظمتوں اور جاہ وجلال کی رفعتوں سے مزین ہے۔ اردو حمدیہ قصیدہ توحید کی حکمتوں، علم وعرفاں اور خالق کائنات کی حمد وتعریف توصیف سے معمور ہیں۔ پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدہ نگاری، تصور ربوبیت، تصور الوہیت، قدرت الٰہیہ، توحید، فلسفہ وحدت الوجود، فلسفہ وحدت الشہود کے رجحانات، خلاقی، اقتدار و اختیارات اور متلاشیان حق کے لیے قرآن کی روشنی میں دلائل توحید بیان کیے گئے ہیں۔ توحید کے پرستاروں کو اردو قصیدہ حمدیہ قصیدے نے رنگارنگ موضوعات اور استدلال توحید سے آگہی فراہم کی ہے۔ مصنف نے قصیدے کے ساتھ ساتھ قیام پاکستان کے بعد کے عمومی مسائل سے بھی بحث کی ہے۔ جو معلومات افزا ہی نہیں قابل غور بھی ہیں۔

دوسرے باب میں، حمد کیا ہے ؟ اصطلاحی مفہوم، حمدیہ قصیدہ کیا ہے؟ اس حصے میں اردو حمدیہ قصیدے کی روایت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں: ''خالق کائنات کی صناعی، عالم بیکراں 'نور وحدت ومحسنات' نکہت اور چمن آرائی 'یکتائی وزیبائی' کبریائی اور رونق رنگ گلستان حمدیہ قصیدہ نگاروں کا فکر سخن اور مرکز ومحور ہے معبود برحق سے استعانت عین ایمان ہے۔ ادبیات مشرق میں حمدیہ قصیدہ نگار کا مقام ومرتبہ اور موضوعاتی کشاکش لائق تحسین ہے یہ بات بلاخوف تردد کہی جاسکتی ہے کہ برعظیم میں حمدیہ قصیدہ نگاروں نے قرآن مجید سے موضوعات کشید کیے ہیں اس لاریب کتاب کی تعلیمات کو شعری قالب میں ڈھال کر شعری تفسیر کا روپ عطا کر دیا ہے۔ یہی اس کا سب سے بڑا حوالہ ہے۔ فنی محاسن اور علم بیان و بدیع کے اعتبار سے اردو حمدیہ قصیدے کی روایت کے تمام قصیدہ نگاروں نے فنی محاسن کو کمال مہارت سے برتا ہے۔

صنائع لفظی و صنائع معنوی کی تراشیدگی کی بدولت حمدیہ قصائد میں بلا کی تاثیر پیدا ہوگئی ہے۔" عباس علی شاہ ثاقب نے اس باب میں حمدیہ قصیدے اور اس کی روایت اور اس کے موضوعات و افکار کے حوالے سے بہت عمدہ اسلوب میں اظہار خیال کیا ہے اور خاطر خواہ نتائج مرتب کیے ہیں۔ تیسرے باب میں موصوف نے بالخصوص مولانا ظفر علی خان کی حمدیہ قصیدوں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ قصیدہ لامیہ اور "خمستان ازل کا ساقی" میں بقول مصنف زبان و بیاں کی چاشنی کے عمدہ نمونے ملتے ہیں جو زبان کی صفائی، خیال کی پاکیزگی، روانی، فصاحت و بلاغت سے مالا مال ہیں۔ روزمرہ و محاورات کے برمحل مناسب معقول استعمال سے چاشنی فزوں تر ہوگئی ہے۔ مولانا ظفر علی خان نے اللہ تعالیٰ کی مدح و ستائش کو بڑے اشتیاق اور انہماک سے حمدیہ قصائد کی زینت بنایا آپ نے حمدیہ قصائد میں موضوعات کو تنوع، خیال آفرینی اور زبان و بیاں کی کامل فنکاری عطا کی ہے۔ اس داور محشر اور ارض و سما کے اختیارات کاملہ اور قدرت کاملہ کو خراج تحسین پیش کر کے کائنات میں پھیلے اسرار کا بھید دیا ہے جس سے بندہ اپنے رب کے قریب ہوتا ہے۔ یوں پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدے نگاری کے معنوی و باطنی گوشے فروزاں اور عیاں ہوگئے ہیں۔ ان کے موضوعات حمد قیام پاکستان کے بعد تقریباً تین دہائیوں کا دور اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کا پیش خیمہ ثابت ہوا ہے۔ مصنف نے بلاشبہ مولانا ظفر علی خان کی تحریک پاکستان اور استحکام پاکستان کے ادوار کو اپنے کلام بلاغت نظام سے مالا مال کیا ہے وہ بہت توانا اور بھرپور شاعر تھے دیگر اصناف کے مانند انھوں نے بہت قابل قدر حمدیہ قصیدے بھی لکھے۔ معاصر و مابعد شعرا کے لیے روشن مثال بن گئے۔ قیام پاکستان سے لے کر 1975 تک کے عہد میں حمدیہ قصیدہ نگاری کا مصنف نے مفصل اور مدلل جائزہ لیا ہے اور مطلوبہ نتائج کے حصول کے لیے خاطر خواہ محنت اور علمی جستجو سے کام لیا ہے۔

باب چہارم میں 2000 تک کے حمدیہ قصائد کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف ثانی میں پاکستانی شعرا نے بحضور حق تعالیٰ ثناگری کی جو شان دار اور لائق صد تحسین مثالیں پیش کی ہیں انھیں دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ نعت نویسی کے ساتھ ساتھ حمد نگاری کا عمل بھی ایک روشن باب کی حیثیت سے کتاب زندگی کا حصہ رہا ہے۔ اس باب میں اثر زبیری، بے چین رجپوری کے حمدیہ قصائد میں پائی جانے والی علم و معرفت کی اکائیوں کو قرآن کی روشنی میں تلاش کر کے زینتِ قرطاس کیا

ہے۔لاریب کتاب سے حوالہ جات دے کر مقالہ نگار نے اپنی قرآن مجید سے گہری وابستگی اور محبت کا ثبوت دیا ہے جس سے انفرادیت اور ابلاغ کی خوبیاں نمایاں ہیں۔

پانچویں باب میں 2000 سے 2022 تک کے حمدیہ قصائد کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ عبدالعزیز خالد، ساحر لکھنوی، غلام علی وفا، سید اصغر علی شاہ، قاضی حبیب الرحمٰن، ڈاکٹر ریاض مجید، ابوالحسن واحد رضوی، ڈاکٹر نوید عاجز اور رفیع الدین راز، شاعر علی شاعر، مظفر عارفی اور راقم مقالہ عباس علی شاہ ثاقب کے قصیدوں کے محاسن بیان کیے گئے ہیں اس باب میں شعرا کے حمدیہ قصیدوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

بیسویں صدی عیسوی میں اردو حمدیہ قصیدے کے جو رنگ ابھرے، اس حوالے سے عباس علی شاہ صاحب نے اظہار خیال کیا ہے۔ موصوف کے مطابق حمدیہ قصیدہ نگاروں کی تعداد انتہائی کم مگر معیار اور فکر کی فراوانی ہے۔ علم بیان و بدیع کے فنی محاسن، کمال تراشیدگی اور جانفشانی سے نبھائے گئے ہیں۔ موضوع کی ہمہ جہت استعداد کار لائق تحسین ہے۔ لب و لہجے کی متانت، سنجیدگی اور شعری لہجہ ژرف نگاہی، آن بان، جاہ و جلال اور دل نشیں اہتمام نے اسے شہ پارہ بنا دیا ہے جسے اکیسویں صدی کے حمدیہ قصیدے کے روشن امکانات کے لیے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا قرار دیا جا سکتا ہے۔

عباس علی شاہ نے جن پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے وہ بہت اہمیت کے حامل ہیں کہ اکیسویں صدی جو نعت کی صدی کے طور پہ متعارف کرائی جا رہی ہے اس میں حمد نگاروں کا حصہ بھی بہت اہمی بہت اہم ہوگا اور وہ یقیناً نئے عہد کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اللہ پاک کی مدح و ستائش کو اپنا فرض عین سمجھ کے اس پہ عمل پیرا ہوں گے۔

اس کتاب کے آخری باب میں مصنف نے قصیدہ نویسی کی عصری صورت حال پر اظہار خیال کرتے ہوئے عبدالعزیز خالد کے قصیدہ نگاری کا مفصل جائزہ لیا ہے۔

عبدالعزیز خالد کے قادر الکلام شاعر ہونے کے حوالے سے کوئی شک نہیں ہے مصنف نے بتایا ہے کہ عبدالعزیز خالد نے غیر مردف حمدیہ قصیدہ ہی لکھا ہے۔ یہ حمدیہ قصیدہ سربریدہ ہے مگر حسن ادائیگی، ندرت خیال اور چاشنی کی دولت سے مالا مال ہے۔ ان کا شعری اسلوب قصیدے کی شان کا عکاس اور غماز ہے۔ ہیئت کی پاسداری اور صنفی تشکیل کے باعث قصیدہ متقدمین کی یاد دلاتا نظر آتا ہے ان کے ہاں فکر و فن نے ایک دوسرے کی تکمیل کر کے عالی شان اور جاہ و جلال کا حامل قصیدہ پاکستانی اردو حمدیہ

قصیدے کی روایت کو عطا کیا ہے جو اردو ادب میں ایک معتبر اضافہ ہے۔ عباس علی شاہ ثاقب نے اس باب میں حمدیہ قصیدوں کے فنی و فکری محاسن کا جائزہ بھی لیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ عباس علی شاہ ثاقب خود بھی شاعر ہیں انھوں نے تین غیر مطبوعہ اردو حمدیہ قصائد "حمدیہ قصیدہ در باری تعالیٰ جل شانہ"، "قصیدہ نور توحید"، اور "حمدیہ قصیدہ ثنائے رب ذوالجلال" لکھے ہیں۔ یہ تعداد یقیناً زیادہ ہوگی۔ ان کا یہ بیان بہت اطمینان بخش اور دل خوش کن ہے: "میں نے اردو حمدیہ قصیدے کے موضوعات کو قرآنی نصوص شرعیہ اور گہرے جذبات و احساسات پر استوار کیا ہے، توحید افعال اصناب الیہ تکوینی دلائل مظاہر فطرت' دعوت غور و فکر' جلالت الٰہی اور تسبیح و تمہید جیسے موضوعات مدح کی زینت بنائے ہیں۔ قوت خداوندی' رحمت و مغفرت' خلاقی و قدرت عظمت و رفعت بروج و شہاب ثاقب، گردش لیل و نہار اور غیب و شہادت جیسے موضوعات سے حمدیہ قصیدے کا چمن معطر کیا ہے۔"

اس باب میں باقاعدہ قصیدوں کے ساتھ ساتھ مصنف نے یک کتابی نظموں کے طور پر طویل نظموں پر بھی بات کی ہے لیکن ان کو بھی قصیدے میں رکھا جا سکتا ہے کہ قصیدہ اپنی دلالت وضعی اور اپنے مزاج میں ایک طویل نظم کی خاصیت بھی رکھتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قصد اور روایتی ہیئت کی اتباع میں لکھا گیا کلام ہی قصیدہ ہوتا ہے۔ صنفی شناخت اور ہیئتی تشکیل میں اس کی شان ہے۔" عباس علی شاہ ثاقب نے ناصر ملک کے شعری مجموعے "لا یموت" حسن عباسی کے حمدیہ مجموعے "سائیں" حمیدہ کشش بانو کے حمدیہ مجموعے "رب کائنات" اور علیم النساء ثنا کے حمدیہ مجموعے "تیری ہی حمد و ثنا" میں شامل ایسی حمدیہ نظموں کی نشاندہی بھی کی ہے مگر یہ منظوم کلام حمدیہ قصائد نہیں کہے جا سکتے۔ زیر نظر کتاب میں حاصل تحقیق کا مطالعہ نہ صرف اردو حمدیہ قصیدوں کی روایت اور معاصر منظرنامے سے آگاہی ہوتی ہے بلکہ خود مصنف کے ذہنی و فکری رجحانات کا بھی علم ہوتا ہے جو ظاہر ہیں بہت مثبت قابل رشک ہیں۔ ان کی یہ رائے چونکا دینے والی ہے کہ پاکستان میں حمدیہ قصیدہ نگاروں کی تعداد نعتیہ قصیدہ نگاروں سے کہیں کم ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم محافل میں نعوت تو پڑھتے ہیں مگر حمد نہیں پڑھتے اور حمدیہ قصائد تو بالکل نہیں پڑھتے تاہم حمدیہ قصیدے کا مستقبل روشن بنایا جا سکتا ہے۔ تمہید یہ قصیدہ ہی دراصل فن قصیدہ نگاری کو شہنشاہ اقلیم ادب کے درجے پر فائز کرتا ہے۔ تکوینی قصیدے کی

سرشت میں وہ اکائی ہے جس کے بغیر اس کا امتیازی وصف ختم ہو جانے کے مترادف ہے۔ قصیدے کی مخصوص ہیئت ہی اس کی شناخت ہے۔" یہ وہ بیانات ہیں جن کی بدولت اس کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے اس لیے کہ مصنف نے اپنے موضوع کی حدود میں رہتے ہوئے کس قدر قابل رشک نتائج مرتب کیے ہیں اور وہ پہلو سامنے لانے میں کامیاب رہے جو آج کے عہد کی بہت بڑی ضرورت ہیں۔

اقبال نجمی نے اپنے مضمون حمد کے رنگ میں نظم کو اس کا ایک اہم زاویہ اور رنگ قرار دیا ہے۔ جب حمد گو اپنے خالق و مالک سے باتیں کرتا ہے وہ جو کچھ کہتا ہے اس میں دعائیہ رنگ بھی موجود ہوتا ہے۔ تعریف وستائش کا رنگ بھی اپنی بہار لیے ہوتا ہے اور بے ساختہ زبان سے کلمات تشکر ادا ہوتے ہیں اپنے خالی ہاتھوں کا کاسہ اٹھاتا ہے تو دریائے رحمت جوش میں آتا ہے۔" (سہ ماہی مفیض گوجرانوالہ، حمد نمبر دوم 2003 ص 18)، اقبال نجمی کی اس رائے میں کی روشنی میں اردو قصیدے میں دعا کا رنگ بے شک وشبہ غالب ہوتا ہے اور اس میں بندہ اپنے خالق و مالک سے اس کی تعریف وثنا کے بعد جو کچھ طلب کرتا ہے وہ ذات پاک اسے اپنی رحمتوں سے نوازتی ہے۔ حمدیہ قصائد میں دو نمایاں موضوعات ہوتے ہیں تعریف و ثنا اور استعانت۔ یہ تقدیس کا وہ زاویہ ہے شریعت طریقت اور حقیقت کے معارف یکجا و یک جان ہو جاتے ہیں۔ یہ اللہ پاک کی حقانیت اور وحدانیت کا اعلان کرنے والی صنف ہے۔ مولانا نعیم الدین مراد آبادی نے اپنی تفسیر میں حضرت شفیق بلخی قدس سرہٗ کے حوالے سے لکھا ہے کہ سعادت کی پانچ علامتیں ہیں۔ دل کی نرمی، کثرت گریہ، دنیا سے نفرت، امیدوں کا کوتاہ ہونا اور حیا، اسی طرح بدبختی کی بھی پانچ علامتیں ہیں: دل کی سختی، آنکھ کی خشکی یعنی عدم گریہ دنیا کی رغبت دراز امیدیں اور بے حیائی۔ یہ باتیں دل کو لگتی ہیں۔ قصیدے کا جو شاعر ہے جو اللہ تعالیٰ کے حضور تعریف وثنا کے گل ہائے رنگا رنگ پیش کرتا ہے۔ بھلا کیوں کر اس کی امیدیں کوتاہ کیوں نہیں ہوں گی اور حیا اس کا زیور کیوں نہیں نہیں بنے گا اور دنیا سے اس کی بے نیازی میں کیا شک ہو سکتا ہے دل کی نرمی تو لازمہ حمد الٰہی ہے۔ عباس علی شاہ ثاقب نے بحیثیت طالب علم نہ صرف حمد جیسے موضوع پر کام کرنا پسند کیا بلکہ وہ خود بھی مداح رب کائنات ہیں۔ حمدیہ موضوعات کی برکات سے وہ بہرکیف سرافراز ہوں گے۔ دل کی نرمی، حیا اور یاد الٰہی کثرت گریہ ان کا مقدر ٹھہرے گا۔

☆☆☆☆☆

بلوچستان کا نمائندہ شاعر.....ریاض ندیم نیازی

بلوچستان کے شہر سبی سے تعلق رکھنے والے ملک کے معروف شاعر و ادیب ریاض ندیم نیازی کا اصل نام ریاض احمد، تخلص ندیم اور قوم نیازی ہے۔ پیر ۱۳/ اگست ۱۹۶۸ کو سبی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام شاہ نواز خان نیازی ہے۔ میٹرک اور ایف اے بلوچستان بورڈ جب کہ بی اے اور ایم اے صحافت کی ڈگری بلوچستان یونی ورسٹی سے حاصل کی۔ پانچ سال تک سیشن کورٹ سبی میں ملازمت کے بعد کمشنر آفس سبی میں پوسٹ ہوئے۔ اس وقت ڈپٹی کمشنر آفس سبی میں بہ طور آفس سپرنٹنڈنٹ اپنے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ آپ نے شاعری کا باقاعدہ آغاز ۱۹۸۲ میں کیا، کتاب بینی کا شوق زمانہ طالب علمی سے تھا۔ مسجد روڈ سبی میں اپنے بھائی کی ٹیلرنگ کی دکان میں لائبریری قائم کی۔ سبی کی واحد لائبریری تھی جو کالج و سکولز کے اساتذہ اور کتاب سے محبت کرنے والے نوجوانوں اور طالب علموں کا مسکن ہوا کرتی تھی۔ اس وقت یہ لائبریری ریاض ندیم نیازی کے گھر میں قائم ہے جس میں تقریباً 12 ہزار سے زائد علمی و ادبی کتب موجود ہیں۔ جس میں سولی و فوجی آفیسران، معروف سیاست دان، علمی و ادبی شخصیات اور ملک کے نام ور شعرا، مذکورہ لائبریری کا دورہ کر چکے ہیں۔ شہر کے علم دوست ساتھی، طلبا و طالبات لائبریری میں موجود کتب سے استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ ریاض ندیم نیازی گیر شہرت کے حامل شاعر و ادیب، نعت خواں و نعت گو ہیں۔

عالمی سطح پر فروغ حمد و نعت کی تحریک انجمن عندلیبان ریاض پاکستان سبی کے جنرل سیکرٹری ہیں۔ حلقہ پاسبانِ حرف پاکستان سبی کے بانی ہیں جب کہ ادب سرائے ساہیوال، کوئٹہ رائٹر فورم، دستگیر ٹرسٹ پاکستان، حضرت غلام دستگیر اکادمی، ادبی فورم سبی، دستک ادبی سنگت، سنگت ویلفیئر سوسائٹی کی شعبہ نعت و ادبی کمیٹی، نعت کالج کمیٹی کراچی، تھنکرز فورم سے وابستگی کے علاوہ سہ ماہی ''رنگ ادب'' کراچی کے مبصر بھی ہیں۔ آپ کا پہلا شعری مجموعہ ''خوش بو تری جوئے کرم'' کے نام سے ۲۰۱۰ میں شائع ہوا۔ اس کے

ہارون رشید تبسم

بعد تین شعری مجموعے ''ہوئے جو حاضر درِ نبیؐ پر''، ''سحرِ تجلیات''، ''جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں''، ''چمن زارِ حمد و نعت'' اور جب کہ ''ساوے گنبد دی چھاں'' پنجابی نعتیہ مجموعہ، مناقب و سلام کے دو مجموعے ''گل زارِ حمد و نعت''، ''فیضانِ اولیا'' غزلوں کے چار مجموعے ''تمھیں اپنا بنانا ہے''، ''یادوں کے بھنور''، ''خوابوں سے بھری آنکھیں''، ''آئینوں کے شہر میں'' نظموں کا مجموعہ ''وفا کے موتی'' ہائیکو کا مجموعہ ''جب سے بچھڑے ہیں'' شائع ہوئے۔ اِن کے لکھے ہوئے مضامین کے دو مجموعے ''دل معمور عقیدت سے'' اور ''نقدِ ہنر'' کے نام سے ۲۰۲۴ میں شایع ہوئے ہیں۔

ریاض ندیم نیازی کی کتب اور شخصیت و فن پر برصغیر پاک و ہند اور وطنِ عزیز پاکستان کے ممتاز اہلِ قلم نے 300 سے زائد تنقیدی، مذہبی اور ادبی مضامین تحریر کیے ہیں فلیپس اور تبصرے ان کے علاوہ ہیں۔ جس طرح پورے ملک میں بلوچستان کے تاریخی اور دوسرے بڑے شہر سبی کی پہچان سبی کی گرمی اور سبی میلہ ہیں ان میں تیسری بڑی پہچان ریاض ندیم نیازی ہیں۔ بے شمار لوگوں نے اس کا اظہار متعدد بار کیا ہے۔

ریاض ندیم نیازی بلوچستان کے واحد شاعر ہیں کہ جنھیں حکومتِ پاکستان کی جانب سے دو بار قومی صدارتی سیرت ایوارڈ اور حکومتِ پنجاب کی جانب سے اُن کے دو شعری مجموعوں کو صوبائی سیرت ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ جو نہ صرف سبی شہر بلکہ صوبی بلوچستان کے لیے اعزاز کی بات ہے۔ مخلص اور محبت کرنے والے دوستوں کو اس پر فخر ہے۔ صوبائی ایکسی لنس ایوارڈ، علامہ اقبال صوبائی ادبی ایوارڈ، محسن نقوی ادبی ایوارڈ، سہروردیہ نعت فاؤنڈیشن انٹرنیشنل لاہور کی جانب سے بہار ریاض ایوارڈ، ریشم رائٹرز ادبی ایوارڈ، خدمتِ خلق ایوارڈ، بابا گرونانک جی ادبی ایوارڈ، شہیدِ اسلم رانا ایوارڈ، فروغ نعت ایوارڈ، جشنِ بہاراں ایوارڈ، نعت ایوارڈ، کوکب و آزاد ایوارڈ، غالب یادگاری شیلڈز اور بے شمار ایوارڈز و شیلڈ حاصل کرنے کا ایک ریکارڈ ہے۔ ان کی کتب پر پاکستان کی مختلف یونی ورسٹیوں سے ایم فل، ایم اے اور بی ایس کے تقریباً 14 ادبی و تحقیقی مقالات تحریر کیے جا چکے ہیں اور متعدد مقالے لکھے جا رہے ہیں یہ بھی ایک ریکارڈ ہے۔ ملک کے ممتاز شاعر و ادیب احمد ندیم قاسمی ریاض ندیم نیازی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ریاض نیازی کی

نظموں میں موجود الفاظ و تراکیب، جذبات واحساسات، تجربات و حوادث اور آہنگ و نغمگی دراصل اُسی حسن، اُسی سچائی کے عکس بند ہیں جسے عام لوگ تو خیر دیکھ ہی نہیں سکتے مگر بعض اوقات خواص بھی اُن کے جلووں سے فیض یاب نہیں ہو سکتے۔ افتخار عارف ان کے شعری مجموعے ''تمھیں اپنا بنانا ہے'' کا مسودہ پڑھتے ہوئے بے ساختہ کہتے ہیں کہ ادبی گہما گہمی کے اعتبار سے نسبتاً بڑے شہروں سے دور بسی میں مقیم ریاض ندیم نیازی کی غزلوں کا مجموعہ ''تمھیں اپنا بنانا ہے'' پڑھ رہا ہوں خوش ہو رہا ہوں اور داد دے رہا ہوں کہ غزلوں میں کیسے کیسے امکانات ہیں اور کیسے کیسے تازہ نفس اور صاحبِ امکان شعرا اردو کی سب سے مقبول صنف میں اپنے تخلیقی جوہر کا اظہار کر رہے ہیں۔ معروف نقاد ڈاکٹر فرمان پوری نے لکھا ہے کہ ریاض ندیم نیازی اپنی شاعری کی عمارت تغزل کی بنیاد پر استوار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے کلام کی صورت گری میں ریاض ندیم نیازی نے شعری قواعد اور فنی ضوابط کی مکمل طور پر پابندی کی ہے۔ پڑوسی ملک بھارت سے تعلق رکھنے والے شاعر شمیم حنفی اِن کے بارے میں کہتے ہیں کہ غزل میں غالباً یہ ظاہر سب سے آسان اور سب سے مشکل کام سہیل ممتنع کا کام یاب استعمال ہے اگر شاعر کے مزاج میں صلابت اور جذبے میں سچائی کے ساتھ زبان پر قدرت نہ ہو تو سہل ممتنع صرف ''سہل'' یا ''ممتنع'' رہ جاتا ہے مگر ریاض ندیم نیازی نے اس مشکل اور نازک مرحلے کو بھی احساس کی صداقت اور فنی قدرت کے ساتھ سر کیا ہے، نیویارک میں مقیم کراچی کے شاعر رفیع الدین راز نے لکھا ہے کہ ریاض ندیم نیازی فکری طور پر اپنے عہد سے بھی جڑے ہوئے ہیں ان کی شاعری میں ہمیں زندگی سے عبارت بہت سے خوب صورت رنگ جلوہ نمائی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ریاض ندیم نیازی اردو ادب کے عشق میں مبتلا رہنے والی شخصیت کا نام ہے ویسے میں انھیں ''صحرائے ادب کا مجنوں'' بھی کہتا ہوں۔ برصغیر کے نام ور شاعر ڈاکٹر بشیر بدر لکھتے ہیں کہ ریاض ندیم نیازی تمہاری غزلیں بار بار پڑھیں ان میں کئی شعر بہت اچھے اور خوب صورت ہیں اتنی کم عمری میں تمھارا شوق تمھیں بڑی دور تک کام یابی کے ساتھ لایا ہے۔ ماہرِ اقبالیات ڈاکٹر ہارون رشید تبسم لکھتے ہیں کہ ریاض ندیم نیازی کی غزل لطیف جذبوں کی عکاس ہے ریاض ندیم

نیازی آج ادبی دنیا میں نیازی نہیں بلکہ جاں بازی کے حوالے سے مقبول ہے۔ اہلِ بلوچستان کے لیے ایک فخر ہے کہ ریاض ندیم نیازی کا تعلق بلوچستان سے ہے ریاض ندیم نیازی بلوچستان کے ماتھے کا جھومر ہے۔ مظفر وارثی لکھتے ہیں ریاض ندیم نیازی نے دامنِ شعر میں جو مطاف حمد تخلیق کیا ہے وہ سجدوں ہی سے آباد نہیں بلکہ آنسوؤں، ہچکیوں اور سسکیوں سے بھی معمور ہے۔ امجد اسلام امجد نے لکھا ریاض ندیم نیازی کا پیرایۂ اظہار سادگی اور پُرکاری کا ایک خوب صورت امتزاج ہے اور یوں اُسے اپنی تائید کے لیے کسی "بلوچستان پیکیج" کی ضرورت نہیں۔ کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ممتاز نقاد و ادیب، سکالر فتح محمد ملک کہتے ہیں کہ بلوچستان کی سرزمین سے ریاض ندیم نیازی کی صدا عشقِ الٰہی اور مودتِ مصطفیٰؐ کی عقیدت کے سوز سے مزین ہو کر ابھری ہے سلاست اور روانی کا تال میل تخلیقی توانائی پر منحصر ہے۔ معروف شاعر خالد شریف کہتے ہیں ندیم نیازی غزل کے میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہیں اپنے آپ میں ڈوب کر غزل کہتے ہیں اور تمام فنی باریکیوں سے خوب آگاہ ہیں۔ ڈاکٹر پیرزادہ قاسم رضا صدیقی لکھتے ہیں کہ ندیم نیازی اپنے وسیع اور وقیع ادبی سرمائے کے سبب بہ جا طور پر اِس دور کے لائقِ اعتنا شاعر ہیں اور یہی سرمایۂ سخن اُنھیں آئندہ زمانوں میں بھی قابلِ ذکر بنائے گی۔ سلیم کوثر نے لکھا ہے کہ ریاض ندیم نیازی کی ذہانت اور فطانت جدید نظم کو جمود کی کیفیت سے نکال کر نیا اعتبار عطا کرے گی۔ اوریا مقبول جان نے لکھا ہے کہ "تمھیں اپنا بنانا ہے" ریاض ندیم کی شاعری کا پہلا مجموعہ ہے اِس کا شوق، تڑپ اور آگے بڑھنے کی لگن اِسے کہاں تک لے جائے گی اس کا پتہ اس کی یہ کتاب ضرور دے رہی ہے۔ اعتبار ساجد لکھتے ہیں ریاض ندیم نیازی بلوچستان کے شعرا میں ایک مخصوص انفرادیت کا حامل شاعر ہے میں اُس کے کس شعر، کس غزل کی ستایش کروں ساری کتاب ہی قابلِ داد ہے۔ وہ ہمارے بلوچستان کا ایک تابندہ ستارا ہے خدا اس کی تابندگی اور تازگی ہمیشہ برقرار رکھے (آمین) مذکورہ بالا شعرا سمیت برصغیر پاک و ہند کے 200 سے زائد اہلِ علم نے ریاض ندیم نیازی کے لیے مضامین، تنقیدی جائزے، پیش لفظ، دیباچے اور فلیپ لکھے ہیں جو ایک ریکارڈ ہے۔

☆☆☆☆☆

لاریب..... فیض احمد فیض شاعر بڑا تھا

1981 میں فیض احمد فیض متحدہ عرب امارات میں آئے ہوئے تھے۔ اور ٹورسٹ کلب ابوظبی میں اُن کی سترھویں سالگرہ منانے کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ اُس وقت ابوظبی کے اکلوتے نثر نگار ہونے کے ناتے مضمون لکھنے اور پڑھنے کی ذمے داری مجھ پر ڈالی گئی۔ یہ مضمون فیض احمد فیض کی موجودگی میں پڑھا گیا تھا۔)

تقریبات کے کرتا دھرتا اظہار حیدر اور شکیل آزاد نے فرمان جاری کیا کہ اسلام عظمی فیض صاحب کے بارے میں مضمون پڑھے گا۔ میرا جرم یہ تھا کہ میرے افسانے لاہور کے ادبی پرچوں فنون، اوراق، تخلیق، سیارہ (ادبی) وغیرہ اور سبھی اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں میں چھپ چکے تھے مگر تب تک میں نے ایک مضمون بھی نہیں لکھا تھا۔ زمانہ طالب علمی میں بہترین دوست، پالتو جانور یا برسات کا دن کی قسم کے مضامین تو لکھے تھے مگر کسی شاعر پر ہاتھ ڈالنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ مضمون اور وہ بھی فیض احمد فیض پر، یہ مضمون میری ادبی جسامت سے کہیں بھاری پتھر تھا۔ پھر یاد آیا کہ 1957 میں جب میں نے ساتویں جماعت میں تھا، میں نے شاعر بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے بارے میں شائع شدہ اشعار اور جنگ آزادی کے واقعات کے تال میل سے کاک ٹیل بنا کر اچھا خاصا دھانسو مضمون لکھ مارا تھا اور اپنے اُردو کے استاد سے خوب داد پائی تھی۔ وہ بات پرانی تھی۔ مردہ آدمی کے بارے میں، چاہے وہ بادشاہ ہی کیوں نہ ہو، بے خوفی سے لکھا جا سکتا ہے۔ مردہ آدمی تک

اسلام عظمی

زندہ مضمون نہیں پہنچ پاتا۔ یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ مردے کی رسائی مضمون تک ہو گئی ہے تو بھی کیا ہے۔ بہادر شاہ ظفر رنگون سے آ کر میرا گریبان پکڑنے سے رہا۔ پھر مضمون لکھنے سے انکار کی گنجائش نہ تھی کہ یہ عزت کا معاملہ تھا۔ پھر یاد آیا کہ چونڈہ' جہاں میرا بچپن گزرا تھا' نارووال سے دور نہ تھا۔ وہاں کے ایک گاؤں جاجن والا میں بچپن کے کچھ دن گزر چکے تھے۔ فیض صاحب کا تعلق نارووال سے تھا اور وہ میرے گرائیں ٹھہرتے تھے۔ گرائیں سے کیا ڈرنا! فیض صاحب سے میری براہِ راست شناسائی نہ تھی تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ میں لاہور میں رہتا تھا مگر کتنے ہی لاہوریے مجھے نہیں جانتے تھے۔ لاکھوں نارووالیے فیض صاحب کو بھی نہیں جانتے ہوں گے۔ انکار کے آخری حربے کے طور پر میں نے منتظمین کی توجہ اس بات کی طرف دلائی کہ میرے پاس فیض احمد فیض کی کوئی کتاب نہیں' مضمون کیسے لکھوں۔ شکیل آزاد نے اپنی زنبیل سے 'دستِ صبا' نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دی۔ یوں فرار کا راستہ بند ہو گیا۔ تو صاحبو!

فیض احمد فیض اِس دور کے اتنے بڑے شاعر ہیں کہ مجھ جیسے درجنوں شاعر مل کر بھی اُن کا رتبہ گھٹا کر انھیں محض نارووال کا شاعر ثابت نہیں کر سکتے۔ لاریب' وہ بڑے شاعر ہیں مگر شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ مخصوص نظریے کے مبلغ بھی۔ جو لوگ کسی نظریے کے مقلد یا مبلغ ہوتے ہیں' اُن کے بھی خواہوں کے ساتھ اُن کے نکتہ چینوں کی تعداد بھی کم نہیں ہوتی۔ ثمر بار درختوں کا یہی المیہ ہے۔ شاعری کے میدان میں فیض صاحب نے اپنے سے آگے چلنے والوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ نظریاتی حوالے سے اُنھوں نے اپنے محبوب کے ساتھ اپنے اور نظریے کی بھرپور ترجمانی کی ہے اور نظریہ شاعری کے ساتھ عمدگی سے جڑ بھی گیا ہے۔ اس جوڑ توڑ کے صلے میں انھوں نے قصیدوں کے ساتھ ہجو کا ذائقہ بھی چکھا ہے۔ فیض صاحب کے نظریات کے حوالے سے سخت باتیں کہی اور لکھی گئی ہیں۔ اور ایسی باتیں کہی اور لکھی جاتی رہیں گی۔ مگر وہ اپنی شاعری کے حوالے سے غیر متنازعہ رہے ہیں اور رہیں گے۔ شاعری کے حوالے سے وہ اپنوں اور پرایوں میں یکساں مقبول ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُن کی نظریاتی طور پر مخالف ایک جماعت کے ساتھ اُس وقت کے اربابِ حل و عقد نے لاٹھی گولی کی زبان سے نمٹنا چاہا تو اس جماعت کا حامی پرچہ صورتِ حال کی وضاحت کے لیے فیض احمد فیض ہی کا شعر کام آیا۔ سچ اور سوچ کا برملا اظہار ہی انسان کو حیوانِ ناطق سے اُٹھا کر اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز

کرتا ہے۔

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

.....

بات پرورشِ لوح و قلم تک رہے تو اچھا ہے۔ مضامینِ دل احوالِ دل تک رہیں تو اچھا ہے۔ دھیما لہجہ سچ کے ڈھول کی تھاپ پر بے ساختہ دھمال ہے۔ بلند آہنگ ڈھنڈورا تماشائی اکٹھے کر لیتا ہے مگر تاثیر گھٹا دیتا ہے۔ آج سے پہلے میں نے فیض صاحب کو دو چار بار دُور سے دیکھا ہے۔ ایک خفیف سی مسکراہٹ اُن کی پہچان بھی ہے اور شخصیت کا خاصہ بھی۔ بھلی لگتی ہے۔ یہ ڈھکی چھپی بات نہیں کہ مسکراہٹ رجائیت کا اظہار ہے۔ مسکراہٹ خود پر غیر متزلزل اعتماد ہے۔ مسکراہٹ ضبط کی انتہا ہے۔ مسکراہٹ عزم کا نشان ہے۔ امتحان میں ثابت قدم رہنا مردانگی ہے۔ صراطِ مستقیم متزلزل ارادے سے نہیں، جذبے کی استقامت سے ملتا ہے۔ فیض صاحب نے جو کہا اُسے سچ کر دکھایا۔

جوُر کے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یاد گار بنا دیا

.....

اُن کی مسکراہٹ کی کرامت ہے کہ زندگی کے منفی پہلوؤں کی موجودگی میں اُن کی نظر مثبت پہلوؤں سے نہیں ہٹتی۔ تلخ حالات میں پرامید رہنا اور رجائیت کا دامن تھامے رکھنا کوئی فیض صاحب سے سیکھے۔ تسلسل سے محوِ سفر رہنا مسافر کے ساتھ راستے کو بھی اعتبار بخشتا ہے۔ حوصلہ دیکھیے:

گو سب کو بہم ساغر و بادہ تو نہیں تھا
یہ شہر اُداس اتنا زیادہ تو نہیں تھا

.....

محبت کا جذبہ ادب کی اساس ہے۔ اس سے ہٹ کر بات کرنے کی کوشش کی بھی گئی تو بات نہیں بنی بلکہ پلے ہی نہیں پڑی۔ وہ محبت کی روایت کے پابند رہے۔ جب اُنھوں نے یہ کہا:

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

.....

تو گلی گلی شور مچ گیا۔ لوگوں نے بات کا بتنگڑ بنا لیا۔ کیسا قیس ہے جو لیلیٰ کو ڈھونڈنے کے بجائے پیٹرول ڈھونڈنے نکل پڑا ہے! یہ کیسا عاشق ہے، جو محبت میں ترجیحات کا قائل ہے! یہ کیسا سچ ہے، جو جذبوں میں ملاوٹ کو روا رکھتا ہے! کئی لوگوں کے نزدیک محبت اور کارِ محبت ہی شرطِ شاعری ہے۔ نقادوں کی نظر لیلیٰ و قیس، شیریں و فرہاد اور ہیر و رانجھا کی محبتوں کے المیہ انجام پر ٹکی رہی۔ اُن کے احساس نے اُنھیں یہ سوچنے پر مجبور نہیں کیا یا پھر انھوں نے یہ اظہار واجب نہیں سمجھا کہ وہ کون

سے عوامل ہیں، جو ایسے المیوں کو جنم دیتے ہیں۔ جدید حسیت فرسودہ احساس کی معروضی شکل ہے۔ اِس بات کا ادراک رکھنے والے اور محبت کرنے والے سرشاری کے اُس مقام پر ہوتے ہیں، جہاں جدائی کا اپنا ایک نشہ ہے۔

جب تجھے یاد کر لیا صبح مہک مہک اٹھی
جب ترا غم جگا لیا رات مچل مچل گئی

.....

عہدِ حاضر کے اَدب کا طالب علم جب 'میر' کے لونڈے اور 'غالب' کی ڈومنی سے آگے بڑھتا ہے اور جنابِ فیض کی شاعرانہ وارداتوں پر نظر ڈالتا ہے تو عجیب سی خوابیدہ کیفیت قلب و نظر کا احاطہ کر لیتی ہے۔ دشتِ تنہائی میں آواز کے سایوں، ہونٹوں کے سرابوں اور پہلوؤں کے گلابوں سے ابھرتی ہوئی مدھم مدھم بوئے گل، نالۂ دل بنتی ہوئی دودِ چراغِ محفل سے کہیں آگے نکل جاتی ہے۔ شاعر وصال سے ہمکنار ہو کر بھی تشنہ رہتا ہے۔ مگر وہ اس تشنگی سے مایوس نہیں۔ یہی تشنگی تو آرزو کے سفر میں زادِ راہ ہے۔ چند شعر دیکھیے:

یادِ غزال چشماں ، ذکرِ سمن عذاراں
جب چاہا کر لیا ہے کنجِ قفس بہاراں

.....

دور افق پار چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ
گر رہی ہے تری دلدار نظر کی شبنم

تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے
کیا کیا نہ دلِ زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں

.....

فنکار شاعر کی عادت ہے۔ دعوتِ مبارزت گویا اس کی گھٹی میں شامل ہے۔ روشنی کی خواہش اسے اُکساتی ہے تو وہ بول اٹھتا ہے۔

ہر رگِ خون میں پھر چراغاں ہو
سامنے پھر وہ بے نقاب آئے

.....

فیض احمد فیض بار بار وصل سے ہمکنار ہوتا ہے مگر خوش فہمیاں اسے شکار نہیں کر پاتیں۔ کامیابی یا ناکامیابی دونوں صورتوں میں وہ بے قابو نہیں ہوتا۔ وہ اپنے حواس میں رہتا ہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی حقیقتوں کو نظر انداز نہیں کرتا۔

ہے وہی بات یوں بھی اور یوں بھی
تم ستم کی یا کرم کی بات کرو

.....

واعظ سے رہ و رسم رہی رند سے صحبت
فیض اِن میں فرق کوئی زیادہ تو نہیں تھا

.....

تمھیں کہو رند و محتسب میں
ہے آج شب کون فرق ایسا

.....

یہ آ کے بیٹھے ہیں میکدے میں
وہ اٹھ کے آئے ہیں میکدے سے

.....

وصل کی شب تھی تو کس درجہ سبک گزری تھی
ہجر کی شب ہے تو کیا سخت گراں گزری ہے

شاعر کے لہجے کا اعتبار ایسا ہے کہ بات دل میں اترتی جاتی ہے۔ دھیمے لہجے میں سرگوشی کرتا ہوا وہ آگے بڑھتا ہے مگر داغ داغ اجالا اور شب گزیدہ سحر اُسے آلیتی ہے۔ وہ تشکیک کا شکار نہیں ہوتا۔ اُسے نہ تو اپنے عشق پر ندامت ہے اور نہ ہی نتیجہ عشق اُسے مایوس کرتا ہے۔

اِس عشق نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اِس دل میں بجز داغ ندامت

.....

اَب احتیاط کی کوئی صورت نہیں رہی
قاتل سے رسم و راہ سوا کر چکے ہیں ہم

.....

اَب اپنا اختیار ہے چاہیں جہاں چلیں
رہبر سے اپنی راہ جدا کر چکے ہیں ہم

.....

یہاں دعوتِ مبارزت ہے مگر الگ ڈھنگ سے۔ یہاں للکار ہے مگر اپنے ڈھب سے۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں کے ساتھ ساتھ صفِ دشمناں کا سامنا بھی ہے۔ وہ خوف زدہ نہیں اور وہ حریفوں کو سامنے آکر مقابلہ کرنے کے لیے کہتا ہے۔ وہ اُنھیں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

غمِ جہاں ہو غمِ یار ہو کہ تیرِ ستم
جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

.....

شاعر ماضی میں زندہ نہیں رہنا چاہتا اور نہ ہی دوسروں کو اس کی ترغیب دیتا ہے۔ وہ سچائیوں کو قبول کرتا ہے اور قبول کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ جو گل کھلنا تھا وہ کھل چکا۔ جو شیشہ ٹوٹنا تھا وہ ٹوٹ چکا۔ بے کار کا ماتم صورتِ حال کو تبدیل نہیں سکتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ شکست کے اسباب کا تعین کر کے اصلاحِ احوال کوشش کی جائے۔

موتی ہو کہ شیشہ جام کہ در
جو ٹوٹ گیا ، سو ٹوٹ گیا
کب اشکوں سے جڑ سکتا ہے
جو ٹوٹ گیا ، سو ٹوٹ گیا

.....

تم ناحق ٹکڑے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

.....

منفی رویہ رکھنے والوں کے لیے فیض صاحب کے پاس دوائیں نہیں۔ وہ اُن کے رویے کا تذکرہ کرنے کے ساتھ مثبت سوچ رکھنے والوں کا تذکرہ بھی کرتا ہے اور دونوں کا موازنہ کرتا ہے۔

یہ کالک بھرتے رہتے ہیں
وہ جوت جگاتے رہتے ہیں

یہ آگ لگاتے پھرتے ہیں
وہ آگ بجھاتے رہتے ہیں

.....

اُسے اپنی کوشش کے بالآخر ثمر بار ہونے کا بھرپور یقین ہے اور حریمِ وطن سے غداری کرنے والوں کے بارے میں اسکا اپنا نقطہ نظر ہے۔

اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل

.....

فیض احمد فیض بے گناہ لوگوں کو انتقام کا شکار ہوتے ہوئے وہ ہرگز ہرگز نہیں دیکھ سکتا اور خاموش رہنے والوں سے پوچھتا ہے کہ میں.....

فکرِ دلداریٔ گلزار کروں یا نہ کروں
ذکرِ مرغانِ گرفتار کروں یا نہ کروں
قصۂ سازشِ اغیار کروں یا نہ کروں
شکوۂ یار طرح دار کروں یا نہ کروں

.....

فکرِ دلداریٔ گلزار..... ذکرِ مرغانِ گرفتار..... قصۂ سازشِ اغیار اور شکوۂ یارِ طرح دار کی بات کرتے ہوئے فیض صاحب آواز کا آہنگ تصویروں میں ڈھلتا جاتا ہے۔ حریمِ وطن سے غداری کرنے والوں کے بارے میں فیض صاحب کا نقطہ نظر واضح ہے۔

دربارِ وطن میں جب اک دن سب جانے والے جائیں گے
کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے کچھ اپنی جزا لے جائیں گے

فیض احمد فیض اِس دور کا بڑا شاعر ہے.....
یہ روایتی جملہ نہیں۔ بقول احسان دانش.....
بھائی وہ (فیض) شاعر بھی بڑا ہے اور آدمی بھی۔ یہ جملہ احسان دانش نے شاہد شیدائی کو روزنامہ 'امروز' کے اُن کے انٹرویوز کے سلسلے 'روبرو' کے انٹرویو کے بعد کی غیر رسمی گفتگو کے دوران کہا تھا۔ اس انٹرویو کے دوران میں اور شفیق سلیمی بھی موجود تھے۔ انٹرویو کے بعد اُٹھے تو رات کے دو بج چکے تھے۔ شاہد شیدائی ہنڈا 70 اور شفیق سلیمی سکوٹر پاک ٹی ہاؤس کے سامنے کھڑی کر کے آئے تھے۔ شاہد شیدائی نے گھڑی پر نظر ڈالی اور کہا 'ہم نے موٹر سائیکلیں پاک ٹی ہاؤس کے سامنے کھڑی کی تھیں۔ پاک ٹی ہاؤس تو بند ہو چکا ہوگا۔' میں نے ڈھارس بندھائی کہ پاک ٹی ہاؤس کھلا اور وہ لوگ پریشان ہوں کہ بندے اندر کہاں چھپے ہوئے ہیں۔

فیض صاحب بڑے آدمی تھے۔ مگر کبھی کبھار ایسے روایتی آدمی بھی تھے جو قدیم شاعرانہ تعلّی اور بے بنیاد خیالات اور بے کار احساسات کا شکار ہو جاتا ہے اور گھڑی گھڑائی صداقتوں اور چوپالوں میں بھانڈوں کی طرح دوسرے کی ہتھیلی پر چمڑے کا چابک مار مار کر چھچھوندریں چھوڑنے والوں کی طرح میکدہ، رند، محتسب، ناصح اور فقیہہ وغیرہ کے الفاظ سے پہلو نہیں

بچا سکتا۔ ایسی مثالیں حضرت فیض کے ہاں کم ہیں مگر ہیں:

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سوئے کوئے یار گزری ہے

....

فقیہہِ شہر سے مے کا جواز کیا پوچھیں
کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں

....

آج تک شیخ کے اکرام میں جو شے تھی حرام
اب وہی دشمن جاں راحت جاں ٹھہری ہے

....

تھی کب ورندو محتسب میں ہے آج شب کون فرق ایسا
یہ آکے بیٹھے ہیں میکدے میں وہ اٹھ کے آئے ہیں میکدے سے

....

اپنی خوبصورتی کے باوجود یہ اشعار میکدہ، رند، محتسب، ناصح کے مستعمل معانی سے ہٹ کر نہ سمجھے جائیں تو مزہ نہیں دیتے۔ اور یہ پرکھ رکھنے والے کتنے ہیں۔ ان کے معانی اضافی (Relative) ہیں جب کہ صداقتیں (Absolute) ہوتی ہیں۔ غمِ انساں کا تذکرہ بجا۔ گھیراؤ جلاؤ بجا۔

حل مگر پائیدار ہونا چاہیے۔ تبدیلی اندر سے آنی چاہیے۔ تبدیلی اندر ہی سے آئے تو بات بنتی ہے ورنہ نعرہ بازی ہے۔ بڑے آدمی کی غلطی بھی بڑی۔ وہ بھی جذبات کی رو میں بہہ جائے تو عام شاعر یا عام آدمی کا کیا حال ہوگا! دھیمے مزاج اور سدا بہار مسکراہٹ پالنے والے فیض احمد فیض سے انتقامیہ باتیں یا انتقامیہ شاعری اچھی نہیں لگتی۔ انتقام اپنی جگہ صداقت سہی مگر ہمارے جھٹلانے کے باوجود انتقام سے بہتر سزا کی روایت بھی موجود ہے۔

شکست خوردہ گروہ دربارِ خدا (حرمِ کعبہ) میں سر جھکائے سزا سننے کا منتظر کھڑا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے...... جاؤ۔ آج کے روز تم پر کوئی الزام نہیں...... اس فیصلے کی برابری دنیا کا کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اس فیصلے نے دنیا کی تاریخ تو کیا جغرافیہ تک بدل ڈالا۔ صداقتوں کی تلاش ختم نہیں ہونی چاہیے اور اگر کسی وجہ سے در گزری نظر انداز کر دی گئی تو غلطی کا ازالہ ہونا چاہیے۔ اگر جزا اور سزا سے ہٹ کر بھی بات بن جائے تو کیا مضائقہ ہے۔

کیسے مانیں حرم کے سہل پسند
رسم جو عاشقوں کے دین کی ہے

....

حرم اور دین کو اپنے لغوی مطالب سے الگ کر کے سوچیں۔ سچ کو ادھورا نہیں رہنا چاہیے کہ ادھورا سچ پورے جھوٹ سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ فیض احمد فیض ہمارے دور کا ایک سچ ہے اور اُسے سچ کے ساتھ رہنا چاہیے۔ لاریب...... سچ کبھی نہیں مرتا۔

☆☆☆☆☆

ارشد رضوی ایک بڑا ناول نگار (تخلیق اور ہنر کا تناظر)

جب میں یہ کہتا ہوں کہ پچھلے چالیس سالوں میں اردو ادب نے بہت تیزی سے ترقی کی ہے تو اس دعوے کے پیچھے گزشتہ چالیس سال کا محض جزوی ادب میری نظروں کے سامنے ہے اگر پورے کا پورا تخلیقی سرمایہ سامنے لایا جائے تو اردو کے ان چالیس پچاس برس کو تخلیقی لحاظ سے تاریخِ ادب میں زرخیز ترین عہد قرار دیا جا سکتا ہے۔

اگرچہ سرمایہ دارانہ اور سرکاری علمی و ادبی مراکز سے مسلسل یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ اب کوئی بڑا شاعر ادیب نہیں رہ گیا یا یہ کہ ادب زوال کا شکار ہے لیکن حقیقت میں ایسا ہرگز نہیں۔ تحقیق تنقید سے لیکر تخلیق تک ہر شعبے میں ایسا ایسا کام سامنے آیا ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ ایسے ہی تخلیقی کارناموں میں ایک کارنامہ ارشد رضوی کا ناول "زرد موسم کی یاداشت" ہے۔

اگرچہ مصنف نے خود تو اسے علامتی خودنوشت قرار دیا ہے لیکن کتاب کے دیباچہ نگار زیب اذکار حسین نے اسے ناول قرار دینے میں ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی اور خود میں بھی اس کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پہ پہنچا ہوں کہ یہ ایک ایسا جدید ناول ہے جس نے اپنی ہیئت خود تلاش کی ہے اور ناک نقشہ خود ہی ترتیب دیا ہے۔ میں یہ بات اس لیے بھی پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اپنی خودنوشت لکھتے ہوئے میں پہلے تو آپ بیتی کے بجائے ناول لکھنے کا سوچا لیکن جب لکھنا شروع کیا تو وہ ایک علامتی سوانحی نظم میں ڈھل گئی۔ میری اس طویل نثری نظم کا نام سرابی ہے جسے لاہور کے کثیر المطالعہ شاعر زاہد ڈار ہمیشہ ناول کہا کرتے تھے۔ "سرابی" اور "زرد موسم کی یاداشت" میں مماثلت یہ بھی ہے کہ یہ دونوں تخلیق پارے خودنوشت ہونے کے باوجود خارجی واقعات کے تسلسل کے بجائے داخلی احساسات کے تسلسل کے تانے بانے سے ارتباط پزیر ہوتے ہیں۔ زرد موسم کی یاداشت دل کی ایسی حالتوں کی کہانی ہے جن کا بیان خارجی مروجہ ذرائع

فرحت عباس شاہ

سے بہت مشکل ہی ہو پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیق کار کو اس کے لیے علامتوں، استعاروں اور زبان کے نئے اسلوب کی مدد اور سہارے کی ضرورت پڑی اور اس طرح جیسے جیسے تحریر صفحہ قرطاس پر آتی چلی گئی زبان کو وسعت اور ادب کو رفعت حاصل ہوتی گئی۔ ہمارے ہاں تخلیقی طور پر بانجھ لیکن شاعر اور ناول نگار بننے کے شوقین جنہیں موسیقی کی زبان میں کوڑ اور عطائی بھی کہا جاتا ہے، پچھلے کچھ عرصے سے مسلسل تخلیق کی نفی کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ اپنی اس مذموم اور رقیق سوچ کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لیے انھوں نے یہ منصوبہ بنا رکھا ہے کہ بار بار یہ کہا جائے کہ تخلیق دراصل الہام نہیں ہنر ہے جو پریکٹس اور مشق سے آتی ہے۔ ایک انتہائی جاہل لیکن ہٹ دھرم مدرس نے تو اس تخلیقی عمل کی مثال کرکٹ کے کھلاڑی سے دی ہے جو مسلسل پریکٹس سے اس لیول پر پہنچ جاتا ہے کہ تیز ترین بال کو بھی بغیر سوچے کم سے کم وقت میں بلے سے روکنے میں کامیاب رہتا ہے۔ میں اس لیے بار بار کہتا ہوں کہ چالاک اور مکار آدمی اوسط درجے کے ذہین لوگوں کے سامنے اپنی چرب زبانی کی کامیابی کی وجہ سے اس زعم جسے نفسیات کی زبان میں اوور کانفیڈینس کہا جاتا ہے کا شکار ہو بیٹھتا ہے کہ خود کو حقیقی دانشور سمجھنا شروع کر دیتا ہے اور بالکل نابالغوں والے خطبے دینے کو اپنے لیے فخر بنا لیتا ہے اور اسے یہ تک اندازہ نہیں ہوتا کہ پڑھے لکھے لوگ اس کی اول فول پر ہنسنے کے علاوہ تعلیمی اداروں کی بدنصیبی پر شدید افسردہ ہیں۔

آپ خود سوچیں جس شخص کو ریفلیکس ایکشن اور کریٹو پراسس کے فرق کا ہی پتہ نہ اسے کس طرح سمجھایا جا سکتا ہے کہ تخلیق ہنر پر فائق ہوتی ہے ہنر تخلیق پر فائق نہیں ہوتا۔ میں سمجھتا ہوں مدرسین کو کم از کم اتنی عقل تو ہونی چاہیے کہ انہیں لاعلمی کی بنیاد پر سنجیدہ موضوعات پر بے دھڑک گفتگو نہیں کرنی انہیں چاہیے پہلے کچھ پڑھ یا پوچھ لینا چاہیے۔

وہ کرکٹ میں کھلاڑی کی جس استعداد کی بات کر رہا ہے وہ بار بار کھیل کھیل کے پیدا ہو جانے والا تیز رفتار اعصابی ردعمل ہے نا کہ تخلیقی عمل۔ ریفلیکس ایکشن جسمانی مشق سے آتا ہے جب کہ تخلیقی عمل فطرت کی طرف سے ودیعت کے بعد احساس کی ریاضت سے آتا ہے۔ بل کہ میرا تو یہ بھی ماننا ہے کہ جسمانی خدوخال کی طرح انسان کا بنیادی لاشعور بھی بہت حد تک ماں کے پیٹ میں وضع ہو جاتا ہے۔

ارشد رضوی کا یہ ناول دراصل لاشعور تک رسائی کے بعد وہاں موجود ذہنی اعمال اور ان تمام کیفیات کو نئی زبان اور نئے اسلوب کی وضع قطع میں ڈھال کے متشکل کرتا ہے جن کا ایک عام آدمی کے لیے سمجھ لینا بھی ممکن نہیں ہوتا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق سو میں سے پچانوے افراد کو اپنی

ذہنی کیفیات کو کیفیات میں سے نکال کر سمجھنے کی اہلیت ہی حاصل نہیں ہوتی لیکن ارشد رضوی جیسا تخلیق کار نہ صرف ان کے وقوف کی صلاحیت سے نوازا گیا ہوتا ہے بل کہ اس کے تخلیقی و جمالیاتی اظہار کی طاقت بھی لیے ہوتا ہے۔

نیند اور خواب کی درمیانی حالت میں لکھی گئی یہ خودنوشت یا ناول جس طرح اپنے خدوخال کے حوالے سے بہت منفرد ہے اسی طرح احساس اور کیفیت کی شدت کے ایسے ارفع مقام پر فائز ہے جہاں اعلیٰ ادب ہی فائز ہوا کرتا ہے۔ میرے علم میں ہے کہ خبروں کو ناول اور لفظی بازیگری کو شاعری بنانے والے بدنصیب لوگوں کو یہ بات سمجھ میں کبھی نہیں آنی کہ تخلیق اور ہنر کی کیا ترتیب اور کیا تہذیب ہے۔ اگر ان کو یہ نظام سمجھ آتا تو آج یہ بیچارے خود تخلیقی طور پر بانجھ نہ ہوتے۔ لیکن آپ یہ دیکھیے کہ یہ کتنے سفاک ہیں کہ خود تخلیقی سطح پر بانجھ ہونے کو قدرت کا فیصلہ سمجھنے کے بجائے تخلیق جیسی خدائی صفت ہی کی نفی پر اتر آئی ہیں اور ٹکریں مار مار کر لوگوں کو یقین دلاتے پھرتے ہیں کہ ہم واقعی شاعر بھی، ناول نگار بھی اور نقاد بھی۔

میں تخلیق اور کرافٹ کے فرق کو مزید واضح کرنے کے لیے ارشد رضوی کے ناول، ''زرد موسم کی یاداشت'' میں سے سب سے پہلا پیراگراف یا باب پیش کرتا ہوں۔ آپ اسے پڑھیے اور محسوس کیجیے کہ کیا یہ صرف بڑے بنے سنورے اور نپے تلے الفاظ ہیں یا کیفیات کی شدت کا شاندار جمالیاتی اظہار ہے؟۔

''تم آج تین مہینے کے ہوتے، یہ لکھتے ہوئے میں کتنا بے بس اور کمزور ہوں، میرے دل کے گلدان پر تمہاری یادوں کے گلاب کھل رہے ہیں، جنھیں آنکھوں کے آنسو دے کر سینچتا رہتا ہوں۔ تمھاری آنکھوں کے گلاب کھلے ہیں، تمھارے لبوں کے گلاب کھلے ہیں، تمھارے مہربان ہاتھ میرے دل پر رکھے ہیں، مجھے یاد ہے، تمہارے ہاتھ بہت نازک تھے اور انگلیاں کسی مصور کی انگلیاں، جو اُداس اور تجریدی تصویریں بناتی ہیں۔ ہم ان دنوں خوب ملتے رہتے تھے۔ میں نے تمھارے ہاتھوں کو چھو کر بھی دیکھا تھا، جو کسی موتیائی شاخ سے مشابہ تھے، اور جب تم مجھ سے جسمانی طور پر دور کر دیئے گئے ہو، تو روحانی طور پر میں تمھیں اپنے بہت ہی قریب پاتا ہوں۔ تب میری آنکھوں میں نجانے کہاں سے پانی آجاتا ہے، اور یہ سنگ دل آنکھیں رونے لگتی ہیں۔ یہ آنکھیں جو کبھی نہیں روئی تھیں ہم نے انھیں رونا سکھا دیا ہے، یہ صرف تمہارے لیے روتی تھیں۔ تمہاری خوشبو شام کی ہوا کی طرح سرسراتی ہے، میں دیکھتا ہوں کہ تم میرے ساتھ ہو، اور تمہارے نہ ہونے کا دکھ میرے خون میں تیرتا ہے۔ کبھی کبھی دل کے پاس اٹک جاتا ہے، جب دل کسی خزاں آلود پتے کی طرح چرچراتا ہے،

مجھے لگتا ہے میں بھی ختم ہوا لیکن تمہاری یاد کی مسیحائی خوشبو مجھے زندہ رکھتی ہے۔ کوئل کوکتی ہے، تو لگتا ہے تم ہو، شام آتی ہے تو لگتا ہے تم آئے ہو، رات کی نیند آنکھوں پر ہاتھ رکھتی ہے، تو لگتا ہے تم بھی سو رہے ہو، صبح کا بے جا پن تمہارے نہ ہونے کی نوید لاتا ہے، پھر دوپہر کا جلتا ہوا سورج اور ایک لمبی تنہائی سب کچھ ویسا ہی ہے، جیسا تم چھوڑ گئے ہو۔ ہاں میں خود کو کچھ بوڑھا محسوس کرتا ہوں، سنو! مجھے تمہارا انتظار ہے تم آجاؤ پھر سے..... تاکہ میں پھر سے تمہارے لیے خواب بنوں.. پھر سے تمہارے لیے کہانیاں لکھوں "۔

یہاں پر میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ ارشد رضوی کے ہاں موجود کرافٹ بھی وہ والا کرافٹ نہیں جو ایک ایک فقرے کو سوچ سوچ کے لکھنے اور بار بار سیدھا ستھرا کرنے والا کرافٹ ہوتا ہے بلکہ یہ ایک بڑے تخلیق کار کا تخلیقی کرافٹ ہے جو کسی مشقت کے نتیجے میں حاصل ہونے کے بجائے تخلیقی نظام کی پیداوار کے طور پر وقوع پذیر ہوتا ہے اور اپنا احساس دلا کے بغیر ابلاغ کو توانائی بخشتا ہے۔

ارشد رضوی کو پڑھتے ہوئے کہیں کہیں قاری کا دھیان فرانز کافکا کی طرف جاتا ہے۔ شاید اس لیے کہ دنیا میں اس طرح کی نثر، تحریر یا ناول زیادہ تعداد میں نہیں ہیں۔ اس لیے جب بھی کہیں دو جگہ پر لاشعوری اعمال کی خارجی جمالیاتی تشکیل کا عمل نظر آتا ہے ہمیں ان میں مماثلت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ حالانکہ ارشد رضوی کافکا سے اگلے عہد کا رائٹر ہے۔ جہاں جہاں کافکا داخلیت کے سامنے بے بس نظر آتا ہے وہاں وہاں ارشد رضوی داخلیت پر غالب اور حاوی نظر آتا ہے۔ ارشد رضوی خارج اور باطن کے درمیان تصادم سے پہلے اپنے داخلی تصادم کی کہانی لکھتے ہوئے بھی اسے کہیں لایعنی و بے معنی ہونے نہیں دیتا اور یہی خوبی اسے ایک نثر نگار سے بڑے نثر نگار کے سنگھاسن پر متمکن کراتی ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ادب میں ٹریش ہمیشہ زیادہ اور حقیقی اعلیٰ ادب کی مقدار کم ہوتی ہے لیکن آج ہمارے مفاد پرست مدرسین نے اور لٹریری فیسٹیول مافیا کے مصنوعی ادیبوں نے ٹریش کو بڑا ادب اور بڑے ادب کو ٹریش کہنا شروع کر دیا ہوا ہے۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ قانونِ قدرت نے ہمیشہ ان بدبختوں کے خلاف فیصلہ دیا ہے۔ میں یہ گزارش کروں گا کہ ادب کا قاری یا طالب علم ادبی بالشتیوں کی بات کو درست تسلیم کرنے سے پہلے ارشد رصوی، علی نواز شاہ، اسد محمود خان اور ریاظ احمد کے ناول ضرور پڑھ لیں۔

مجھے خوشی ہے کہ سرزمین کراچی نے جس طرح اردو کو ہمیشہ بڑے شعرا، بڑے محققین اور بڑے ادیبوں سے نوازا ہے آج ارشد رضوی کی شکل میں ایک بڑا ناول نگار بھی عطا کیا ہے۔ کراچی زندہ باد

☆☆☆☆☆

نجیب احمد کی فکری خوشبو

اک رہِ ویران ہم بھی ہیں مگر لگتے نہیں
دور تک سنسان ہم بھی ہیں مگر لگتے نہیں

.....

رات بھر پھرتے ہیں گلیوں میں بدل کر بھیس ہم
شہر کے سلطان ہم بھی ہیں مگر لگتے نہیں

.....

اردو شعر و ادب کی خوش قسمتی رہی ہے کہ اسے ہر دور میں نابغۂ روزگار شخصیات میسر رہی ہیں جنھوں نے اردو زبان کی چاشنی، مٹھاس، رچاؤ اور معیار کو اپنے خوبصورت اور لازوال اشعار میں شعور و فکر کی گہرائیوں سے بام کمال تک پہنچایا۔ قلی قطب شاہ سے لے کر فرحت عباس شاہ تک ایسے ایسے ہیرے اور نگینے اردو ادب کو ملے جنھوں نے ایک دنیا کی آنکھوں کو خیرہ کیا اور ایک عالم کو اپنے افکار کی تابانی سے بقعۂ نور بنایا۔ اردو شعر و ادب نے ہماری معاشرت، اقدار، ثقافت اور تہذیب و تمدن پر گہرے اور انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ معاشرتی و سماجی بدلاؤ، مثبت و منفی رجحانات ادب کے ہی مرہونِ منت ہوتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جس معاشرے میں شاعر و ادیب اپنی فکر و نظر اور لکھنے و بولنے میں آزاد ہو وہ معاشرے کبھی بھی بربادی کا شکار نہیں ہوتے کیونکہ فہم و ادراک اور شعور و فکر رکھنے والے کی سوچ اور وژن عام آدمی سے بہت بلند ہوتا ہے وہ لوگوں کو مستقبل دکھانے کی کوشش کرتا ہے بُرے اور بھلے کی تمیز سکھاتا ہے آنے والے خطرات کی نشاندہی کرتا ہے اور سب سے بڑی بات ظلم اور جبر کے خلاف کھڑے ہونے اور بولنے کا شعور اور سلیقہ عطا کرتا ہے۔ اسی لیے جب آمریت اور فسطائیت کسی معاشرے یا ملک کو اپنی

فیصل زمان چشتی

گرفت میں لے کر برباد کرنے کا سوچتی ہے تو سب سے پہلے اُن کے اہلِ علم اور اہلِ قلم کو اپنے قابو میں کرتی ہے ان سے اپنی مرضی کا کام لینے کی کوشش کرتی ہے یا پھر زبردستی منہ بند کرواتی ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے معاشرے اور ملک کے حالات آپ کے سامنے ہیں اس کا تجزیہ کرلیں آپ کو ساری بات سمجھ آجائے گی۔

شاعری خدا کی طرف سے ودیعت کی جاتی ہے۔ قدرت سب سے بڑی مصور اور تخلیق کار ہے۔ حقیقی شاعری آمد ہے جس کا نزول ہوتا ہے۔ یہ تخلیقی عمل ہے جس کا لفظوں کے ہیر پھیر اور جوڑنے سے ہرگز تعلق نہیں۔ مصرع خود بخود اُترتا ہے الفاظ کا چناؤ بھی بعض اوقات شاعر کے بس میں نہیں ہوتا تراکیب بھی بنتی چلی جاتی ہیں، جس کے خیال و افکار میں طہارت و پاکیزگی ہوتی ہے اس کا مصرعہ اُتنا ہی خوبصورت شفاف اور دل میں اترتا ہے۔ بالغ نظر شاعر کی شاعری ہر دور میں اپنا اثر رکھتی ہے اور ہر طرح کے حالات سے منطبق نظر آتی ہے۔ مصرعے اور شعر زندہ بھی اسی لیے رہتے ہیں اور سفر بھی کرتے ہیں کہ ان کی آفاقیت اور فکر کی گہرائی ان کے الفاظ کو بے پایاں اور لامحدود کردیتی ہے۔ بالکل اسی طرح نجیب احمد صاحب بھی ہماری اردو زبان کے اُن شعرائے کرام میں شامل ہیں جنھوں نے اس معاشرے کو اور اس میں رہنے والوں کو نہایت قریب سے دیکھا بندھن بنتے دیکھے اور ٹوٹتے بھی دیکھے۔ امیر کو بھی دیکھا غریب کو بھی دیکھا فطرت اور بناوٹ دونوں کا مشاہدہ کیا سچ کیا ہے، جھوٹ کیا ہے غرض ہماری معاشرت کے ہر پہلو سے وہ آشنا تھے اور اس کے مثبت اور منفی پہلو بھی اُن پر عیاں تھے اور جب ہم اُن کی شاعری پڑھتے ہیں تو یہ سب باتیں وہ بیان کرتے اور کھولتے نظر آتے ہیں کیونکہ وہ معاشرے کے حساس افراد میں شامل تھے اور بات کو خوبصورت اور لطیف پیرائے میں بیان کرنے کا ہنر بھی جانتے تھے اس لیے ان کے اشعار دل میں اُتر جاتے ہیں۔ بامقصد اور جدید شاعری میں اُن کا نام بہت اعلیٰ وارفع ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

یکدم کسی نے ریل کی زنجیر کھینچ دی
گاڑی رکی تھی دشت میں ہم بھی اُتر گئے

تاریکیوں کی لوٹ میں کیا جانے کیا ہوا
پَو پھوٹتے ہی شہر میں نوحے بکھر گئے

.....

حصارِ آبِ شر میں آگئی ہے
مری کشتی بھنور میں آگئی ہے

جواں ہوتے ہی اک مفلس کی بیٹی
زمانے کی نظر میں آگئی ہے

کب ضرورت بھرے کاسے کی طرف دیکھتے ہیں
ہم بھکارن کے لبادے کی طرف دیکھتے ہیں
چھاؤں کیا کیا، میسر ہے مگر ہم پھر بھی
ایک دیوار کے سائے کی طرف دیکھتے ہیں

.....

ہوائے رُخ دکھائے جا رہے ہیں
ہمارے گھر جلائے جا رہے ہیں
ہماری آنکھ تک پتھرا رہی ہے
یہ کیا منظر دکھائے جا رہے ہیں
جہاں سر کو اٹھانا چاہیے تھا
وہاں آنسو بہائے جا رہے ہیں

.....

صرف اک آدمی کے جانے سے
گھر کا سارا نظام ابتر ہے
کون روکے گا ٹوٹنے سے ہمیں
ایک رہزن ہمارا رہبر ہے
اس لیے بیک مانگتے ہیں نجیب
وقت کا بادشہ گداگر ہے

.....

ایسی دہشت تھی میرے شہر میں قاتل کی نجیب
گھر سے باہر کوئی نکلا نہ بچانے مجھکو

.....

درج بالا اشعار کی کاٹ خوبصورتی بے ساختگی اور سلاست آپ کے سامنے ہے ایسے اشعار وہ بندہ ہی لکھ سکتا ہے جو بندہ ہی لکھ سکتا ہے جو معاشرے کا نباض ہو جس نے لوگوں کے درمیان زندگی گزاری ہو جو لوگوں کے دکھ سکھ میں اُن کا مونس و ہمدرد ہو اور لوگوں کی تکلیف اور دکھ کو اپنا دکھ محسوس کرے ارو پھر تخلیقی عمل وقوع پذیر ہو احساسات و جذبات کا مدوجذر جب انسان کی ذات کے اندر ٹھاٹھیں مارتا ہے تب جا کے ایسی شاعری ہمارے سامنے آتی ہے، جو آئینے کی طرح لگے جس میں ہمیں اپنے زخم نظر آئیں، جو ہمارے احساس اور کیفیات کو آشکار کرے۔ ایسی شاعری ہی مقصدیت اور حقانیت کا مظہر ہوتی ہے۔ انھوں نے ہمیشہ ظلم جبر اور معاشرتی بے اعتدالیوں کے خلاف لکھا اور ایسا لکھا کہ وہ اپنے عہد کی تاریخ کا حصہ بن گیا۔

نجیب احمد کی شاعری کی ایک بڑی خصوصیت ان کا ابلاغ تھا یہ قاری سے براہ راست مخاطب ہوتے ہیں اور اپنی بات کہہ جاتے ہیں کہ جس سے کوئی ابہام باقی نہیں رہتا سہل ممتنع بھی ان کی شاعری کے بنیادی اوصاف میں شامل ہے اور سہل ممتنع میں لکھنا سب سے مشکل کام ہوتا ہے۔

نجیب احمد ذاتی طور پر انتہائی خوبصورت اور نفیس شخصیت کے حامل تھے۔ اسی لیے شاعری میں ان کا لب و لہجہ اور اسلوب نہایت شستہ اور شائستہ ہے، انھوں نے کبھی بھی اپنے معیار سے کمپرومائز نہیں کیا

اور اپنے شعری سٹینڈرڈ ہمیشہ برقرار رکھا۔ نہایت اُجلے اور شفاف کردار کے مالک تھے، کسی بھی حوالے سے اُن پر کبھی کوئی اُنگلی اُٹھانے کی جرأت نہ کر سکا اور یہ آج کل کے بے ہنگم معاشرے اور دورِ ابتلا میں بہت بڑی بات ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ شاعری کو جذبات اور احساسات کی منتقلی کا بہت بڑا اور موثر ذریعہ سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کیفیات اور احساسات کو موتیوں سے پروئی ہوئی لگتی ہے۔ چند اشعار جو مجھے بہت زیادہ پسند آئے وہ دیکھیے:

بھنور آنکھوں میں پیدا ہو رہا ہے
کہ دل میں حشر برپا ہو رہا ہوں
بشر بے موت مارے جا رہے ہیں
مسیحائی کا چرچا ہو رہا ہے
ہم ایسے بھی گئے گزرے نہیں ہیں
ہمارے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے
نجیب اک دن جو پاؤں پڑ رہا تھا
وہ پانی سر سے اونچا ہو رہا ہے

کچھ اشعار اور دیکھیے اور سر دھنیے:

میں تیرے ساتھ تری چال چل نہ جاؤں کہیں
تری نگاہ کی صورت بدل نہ جاؤں کہیں
حصارِ عشق سے باہر بھی لوگ بستے ہیں
تری گرفت سے میں بھی نکل نہ جاؤں کہیں
یہ کون میری جڑیں کاٹنے کی فکر میں ہے
کیسے یہ ڈر ہے کہ میں پھول پھل نہ جاؤں کہیں
دمک اٹھا ہے مرے دل میں درد کا سورج
نجیب، حدتِ غم سے پگھل نہ جاؤں کہیں

.....

نجیب احمد چونکہ ایک نرم دل اور گداز طبیعت کے مالک تھے اس لیے ان کی شاعری میں دکھ اور کرب کی کیفیات جابجا بکھری نظر آتی ہیں وہ ان کا اپنا دکھ بھی ہے اور لوگوں کا دکھ بھی جس کو بھی وہ اپنا ہی دکھ سمجھتے ہیں یعنی کہ انھوں نے غمِ ذات اور غمِ کائنات دونوں کو ایک سمجھا اور اپنی ذات کے دکھ سے لوگوں کا دکھ بڑا سمجھا اور اپنی شاعری کے ذریعے اس کو آگے بھی پہنچایا اور اپنا فریضہ بھی انجام دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ:

نجیب اک دن یہ خلقت اُٹھ پڑے گی
لبِ صادق ہوں اور حرفِ اذاں ہوں
نہ ختم ہونے میں آئے یہ روشنی کا سفر
کہیں چراغ کہیں دل جلا دیا جائے

.....

نجیب احمد صاحب نے ہر صنفِ ادب میں طبع آزمائی کی حمد، نعت، سلام، منقبت، نظم اور غزل غرضیکہ وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے غزل ان کا خاص میدان رہا، جس میں اُنھوں نے ہر موضوع پر بات کی۔ اُن کی غزل کی بڑی خوبی اس میں موضوعات کا تنوع فکر کی گہرائی اور سماج کی بھلائی تھی۔ منقبت اور سلام میں بھی وہ نہایت عقیدت اور احترام پیشِ نظر رکھتے تھے اور اپنے جذبات کا اظہار نہایت

ادب واحترام سے کرتے تھے۔ تبرکاً ان کے سلام کے کچھ اشعار دیکھیے۔ اہلِ بیت اطہار سے ان کی عقیدت ان کا اثاثہ اور پہچان تھی:

لہجہ شہِ لولاک کی مانند کھرا تھا
پیاسا تھا سمندر کی طرح بول رہا تھا
کچھ ایسی حضوری کہ نہ دیکھی نہ سنی تھی
سر تن سے جدا ہو کے بھی سجدے میں پڑا تھا
نیزے پہ کھلی کب ترے قامت کی قیامت
ہر مردِ خدا نورِ خدا دیکھ رہا تھا
اک نکتہ جگہ پائے نہ قرآن سے ہٹ کر
قرآن تھا کہ پیرہنِ آلِ عبا تھا

.....

خالدہ احمد اور نجیب احمد کی جوڑی ادب کی سب سے معروف جوڑی تھی اور دونوں بڑی شخصیات نے تمام عمر اپنی دوستی کا پاس رکھا جس کی اب تک مثالیں دی جاتی ہیں۔ ایک وقت تھا کہ لاہور کی کوئی ادبی تقریب خالدہ احمد اور نجیب احمد کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی ان کے اس رشتے سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ تعلق بنانا بھی جانتے تھے اور نبھانا بھی جانتے تھے اور آج کل کے نفسا نفسی کے دور میں یہ کسی معجزے سے کم نہیں ہے ادبی سیاست میں بھی وہ حصہ لیتے تھے اور ہمیشہ اُن کا مؤقف دوٹوک رہا۔ بے اصولیوں اور بے ضابطگیوں کے ہمیشہ خلاف رہے بل کہ اُن کی آواز سب سے نمایاں رہتی تھی یہی وجہ ہے کہ تمام ادبی حلقوں میں ان کا نام نہایت عزت وتکریم کے ساتھ لیا جاتا ہے اپنی صحت کی خرابی کے باوجود وہ 2017 سے 2019 تک ہمارے حلقے کی مجلسِ عاملہ کے رکن بھی رہے وہ سینئرز کے ساتھ چلنے والے اور جونیئرز کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ وہ اتنی بڑی شخصیت ہیں کہ ایک مضمون یا ایک نشست میں اُن کے کام اور ان کی ذات کا احاطہ کرنا نہایت مشکل بلکہ ناممکن ہے مگر یہ اُن کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اُن کی تخلیقات پر تحقیق وتنقید کا کام ہونا چاہیے اور میری التماس ہے کہ ہمارے وہ لیجنڈز جن کی تمام عمر کارزارِ ادب میں گزری ہے کالج اور یونیورسٹیز میں۔ اُن پر خصوصی کام ہونا چاہیے تاکہ جن لوگوں نے اپنی تمام عمر ادب کو دے دی ان کا کچھ نہ کچھ تو حق ادا ہو سکے۔ آخر میں پھر ان کے چند اشعار:

عشق آباد فقیروں کی ادا رکھتے ہیں
اور کیا اس کے سوا اہلِ انا رکھتے ہیں
ہم تہی دست کچھ ایسے بھی تہی دست نہیں
کچھ نہیں رکھتے مگر پاسِ وفا رکھتے ہیں
زندگی بھر کی کمائی یہ تعلق ہی تو ہے
کچھ بچے یا نہ بچے اس کو بچا رکھتے ہیں
شعر میں پھونکتے ہیں اپنی زباں کے چھالے
نطق رکھتے ہیں مگر سب سے جدا رکھتے ہیں
اک تری یاد گلے ایسے پڑی ہے کہ نجیب
آج کا کام بھی ہم کل پہ اُٹھا رکھتے ہیں

☆☆☆☆☆

”میں تری جستجو میں رہتا ہوں“

شکور احسن سے سلام ودعا تقریباً دو عشروں پر محیط ہے، ایک دو مواقع پر تعلقات میں ہلکے پھلکے اُتار چڑھاؤ یا ادبی نوک جھوک کو چھوڑ کر اب یہ مراسم دوستانہ دائرہ سے نکل کر برادرانہ تعلقات کی حدود میں داخل ہو چکے ہیں، ہمارے اس پیچ گوجرخانیے دوست کا تعلق یوں تو پنجاب پولیس سے ہے لیکن سرتاپا اپنے ادبی مزاج کے باعث وہ پولیس کی نوکری کے لیے ”مِس فٹ“ بلکہ یوں کہیے ”اَن فٹ“ ہے، اسی لیے وہ متعدد ادبی محاذ سر کرنے کے باوجود تاحال کوئی ”محکمانہ کامیابی“ یا ”محکمانہ ترقی“ حاصل نہیں کر سکا، شکور احسن میدان تحقیق میں اترا تو ”گوجرخان میں فنون وادب کی مختصر تاریخ“ اور اپنے گاؤں کے متعلق تحقیقی کتاب ”کہانی ایک گاؤں کی“ لکھ ڈالی، بچوں کے ادب کی طرف آیا تو ”تحفہ“ اور ”بابا چراغوں والا“ کے نام سے بچوں کی کہانیوں پر مبنی دو کتابیں شائع کر دیں، اردو افسانہ لکھنے پر آیا تو ”لہو میں ناچتی وحشتیں“ اور ”آنکھ میں چبھتی ریت“ کے نام سے دو افسانوی مجموعے قارئین کی خدمت میں پیش کر دیئے، گیت نگاری کا شوق چڑھا تو ”نیلی اُکھیاں آلی“ کے نام سے پوٹھوہاری گیتوں کی کتاب شائع کر دی، ماہیا نگاری پر آیا تو ”پینگاں“ کے نام سے پوٹھوہاری ماہیوں کی کتاب لکھ ڈالی، پوٹھوہاری غزلوں کی کتاب ”ہمبل“، پوٹھوہاری نظموں اور غزلوں کی کتاب ”جھکھڑ سے منظر تھکے“، پوٹھوہاری شعرا کے کلام کا انتخاب ”کوسے کوسے ساہ“، اردو غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ”آنکھیں پڑھ لیں“، پوٹھوہاری غزلوں کا مجموعہ ”اُکرے“ بھی شکور احسن کی محنت شاقہ کا منہ بولتا ثبوت ہیں، کتابی سلسلے ”مضراب“ کے مدیر کے طور پر ”گوجرخان میں اردو افسانہ نگاری کا ارتقا“ اور ”گوجرخان میں پوٹھوہاری افسانہ نگاری ناں ارتقا“ کے زیر عنوان دو خصوصی نمبروں کی اشاعت بھی اس کے کریڈٹ پر ہے، اس کا تازہ ترین کارنامہ خطہ پوٹھوہار کی منتخب ادبی شخصیات پر مضامین کی کتاب ”سبز

فیصل عرفان

آوازیں" کی اشاعت ہے۔ جس پر وہ بجا طور پر مبارکباد کا مستحق ہے۔

شکور احسن اپنی محکمانہ تعیناتیوں کے دوران جس شہر میں بھی جاتا ہے وہاں ادبی سرگرمیاں عروج پکڑ لیتی ہیں، ادبی تنظیمیں بنانا تو جیسے اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، ٹیکسلا، واہ کینٹ، کہوٹہ، چونترہ، راولپنڈی میں تعیناتی کے دوران وہ ادبی تنظیم سازی میں مصروف رہتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ اس کی مساعی سے بنی بعض ادبی تنظیمیں اب غیر فعال ہیں، گوجر خان کی بات کریں تو ادبی تنظیم "بزم سخن" کے زیر اہتمام مسلسل دس سال تک تنقیدی نشستوں کا انعقاد کر کے کئی پرانے جغادریوں کی "ہٹیاں" بند کرا دیں جو خالی دکان کے کاؤنٹر پر بیٹھ کر کئی سالوں سے "سودا" فروخت کر رہے تھے۔

شکور احسن کو پولیس ملازمت کے باعث یہ "ایج" حاصل ہے کہ وہ "ممنوعہ" اور "غیر ممنوعہ" نشہ کی سہولت کسی بھی وقت حاصل کر سکتا ہے لیکن حیران کن طور پر ہمارے اس دوست کو اگر کوئی "لت" (یہاں پوٹھوہاری زبان والی لت بھی استعمال ہو سکتی ہے) پڑی بھی ہے تو وہ صرف اور صرف شعر و ادب کی ہے، اور یہ ایسا نشہ ہے جو شکور احسن چھوڑنا چاہے بھی تو نہیں چھوڑ سکتا۔ کئی بار ادبی وٹس ایپ گروپوں پر ہم نے اس کی طرف سے یہ "اطلاع عام" سنی کہ "اب میں ادبی سرگرمیاں چھوڑ کر گھر اور بچوں پر وقت صرف کروں گا"، لیکن پھر چند ہی ہفتوں بعد خود ہی قسم توڑ کر پھر شعر و ادب کی آبیاری کرنے لگتا ہے۔ ان "مخصوص ایام" میں وہ جس ادبی دوست سے ملتا ہے اس سے سن گن لیتا رہتا ہے کہ آج کل کس کتاب پر کام کر رہے ہو، فریق ثانی جب اس سے پوچھ لے کہ آپ آج کل کیا کر رہے تو ہنس کے ٹال دیتا ہے اور پھر کچھ ہی عرصے بعد ان "مخصوص ایام" سے فراغت ملتے ہی کوئی نہ کوئی نئی کتاب منظر عام پر لے آتا ہے۔

یہ مختصر تحریر چونکہ فی البدیہہ لکھ رہا ہوں اس لیے شکور احسن کی اردو اور پوٹھوہاری شاعری کی کتابوں سے منتخب اشعار پیش کرنے سے قاصر ہوں البتہ اتنا ضرور ہے کہ اس کے دو اردو اور ایک پوٹھوہاری شعر مجھے ازبر ہے جو یہاں بھی تحریر کیے دیتا ہوں۔ آپ بھی پڑھیے اور شکور احسن کو داد دیجیے۔

ہم زمانے میں، کس، کس کی پوجا کریں
جو بھی اچھا لگا وہ خدا ہو گیا

اس لیے بھی وضو میں رہتا ہوں
میں تری جستجو میں رہتا ہوں

سنگیو! آپوں ہلنا پیسی
ہتھ اِچ سورج مَلنا پیسی

☆☆☆☆☆

افتخار شوکت..... ایک اور قاسمِ محبت

کہتے ہیں کہ ہم ''گلوبل ویلیج'' میں رہتے ہیں۔ حیرت ہے کہ گوگل میپ پر چیچہ وطنی سے ساہیوال کی مسافت 46 کلو میٹر صاف نظر آتی ہے۔ کنارِ راوی کی اس بستی میں بستے بستے سالوں بیت گئے، مگر لاکھوں کی آبادی میں گنے چنے ادب کے سجادہ نشینوں کے اس شہرِ غزل میں ادب کے اس پجھوکڑ طالب علم اور ابنِ شاعر (خادم رزمی، ہجری ایوارڈ یافتہ شاعر) کو بسم اللہ کے گنبد میں، مجید امجد کی زربخت سرزمین میں خلاقانہ خوبی سے شاعر ''افتخار شوکت'' سے تعارف ہوا مگر ''خوشبو تیرے نام'' اور ''غزلیں تیری آنکھوں جیسی'' جمالیاتی انبساط سے لطفِ سخن کشید کر سکے اور نہ انھیں کسی مشاعرے میں واہ واہ کرتے سنا۔

کیسا ہے یہ گوبل ویلیج؟

اجنبیت کی سرحد سے پرے اور پہچان کی پگڈنڈی پر گلاب رستوں پر سفر تک بخت آور بنا، جب 22 ستمبر 2020 ڈاک میں لاہور سے ریزۂ حرف چننے کے لیے بھی سجائی، پُرخروش خوبصورت اشعار سے مزین، دیدہ زیب سرورق اور سجل شاعری سے پیراستہ کتب..... پیار کی پہلی بارش ..... میں بھیگتا چلا گیا۔ من کو شانتی ملی اور ..... محبت روشنی ہے..... کی نظموں میں اُجلے جذبوں سے ہمکنار ہوا تو سوچا کہ شخصیات کا تاثر ملاقاتوں کی تعداد سے نہیں، ان کے عمق سے عمارت ہے۔ بسا

منیر ابنِ رزمی

اوقات بقول میر:

عمر بھر ایک ملاقات چلی جاتی ہے

.....

افتخار شوکت ایڈووکیٹ سے پہلی بار میری ایک ہی "کتابی ملاقات" ہوئی جو اس کتابی چہرہ کے بارے میں گہرا تاثر چھوڑ گئی، جس کا نقشِ جمیل میرے ایک برادر عزیز، خوش نہاد، خوش اندام، پُر بہار زمزمہ سخن سنج اور "عشق جنہاں دی ہڈی رچیا" ناعت..... علی رضا خان..... نے اپنے مشاہدہ پُر بان کو چسپاں کیا تھا۔

"پیار کی پہلی بارش" کا خالق افتخار شوکت ایڈووکیٹ بھی علی رضا خان کی طرح وکیلِ محبت ہے۔ اسی لیے یہ دونوں کبھی بھی کسی ادبی سیاست کے دھڑے یا دھڑے بندی سے منسلک نہیں رہے۔ نہ ہی کبھی شہرت کے لیے بے چین ہوئے۔ نہ کبھی مشاعرہ پڑھنے کیلیے ٹی وی کے چکر کاٹے، جس سے تعلق رہا بے غرض اور غیر مشروط محبت سے رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ محبت تقسیم کرنے کے عمل میں سرگرداں رہے۔ والدِ گرامی خادم رزمی کا زرخواب سے ایک شعر حسبِ حال ہے کہ:

دھوپ دھوپ لوگوں کے، چھاؤں چھاؤں لہجے سے
اے حیات کے صحرا! تو نے ابر پائے ہیں

.....

علی رضا خان..... اندھیروں میں کرنیں پھینکنے کے لیے وفا قدم اور صبا رفتار ہیں۔ صد شکر کہ یہ "علی رضا" ہیں۔ وہ "خان" نہیں تھا، جس کا لڑکا شاعر تھا اور غزل بھی کہتا تھا۔ یہ سلسلہ کافی عرصے سے جاری تھا۔ ایک دن "وہ" خان صاحب، گھر میں داخل ہوئے اور سیدھے اپنے صاحب زادے کے کمرے میں گئے۔ انھوں نے اسے خوب مارا پیٹا۔ چیخ و پکار پر خان صاحب کی اہلیہ بھاگی بھاگی آئی اور استفسار کیا کہ معاملہ کیا ہے؟ خان صاحب نے بتایا کہ ان کے دوست نے انھیں آج غزل کا مطلب سمجھایا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ لکھتا پڑھتا رہتا ہے یہ تو سارا دن "عورتوں" سے باتیں کرتا ہے۔

غزل کے ایک معنی عشق و محبت کی باتیں بھی کرنا ہیں۔ محبت ایک کشش ہے۔ روحانی مقناطیسی قوت، جو جسم کی دیوار میں نفوذ کر کے دل کے اندر جو آسمانی انسان رہتا ہے، اس پر جذبۂ نور کی کرنیں ڈالتی ہے۔ اس کا اثر قریب بھی ہوتا ہے اور دور بھی۔ حضور میں بھی اور غیاب میں بھی۔ سفر میں بھی حضر میں بھی۔ جب محبت کا جذبہ ایک انداز سے آگے نکل جاتا ہے تو دنیا کے تمام امور کی نسبت اس امر کی خواہش ہمارے دل میں سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ دیگر تمام

خواہشات اس ایک خواہش پر ہم نثار کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اندر بوٹی مشک مچایا، جاں پھلن تے آئی ہو۔

اسی کا نام عشق ہے۔ عشقِ الٰہی ہو یا عشقِ نسائی۔ عشقِ دنیوی ہو یا عشقِ اخروی، عشقِ حقیقی ہو یا عشقِ مجازی، عشق اپنی شرح خود کرتا ہے۔ صورتِ نقش کفِ پائے یار اور خیال بُوئے گُوئے دلدار بھی مرغوب اور عزیز بن جاتا ہے۔ افتخار شوکت اپنے مجموعۂ غزل "پیار کی پہلی بارش" میں کہتا ہے کہ:

کن جہانوں سے گزر رکھا گیا
عمر بھر محوِ سفر رکھا گیا

.....

پاؤں لگے ہوئے تھے کسی راستے کے ساتھ
پاؤں کے ساتھ یا کوئی رستہ لگا رہا

.....

کب گزاری ہے زندگی میں نے
زیست مجھ کو گزارتی جائے

.....

تو پیار کی پہلی بارش میں اس کی تشنگی یوں مطالبہ کرتی ہے:

بوندیں تو مری پیاس بڑھاتی ہیں اور بھی
صحرا مزاج ہوں مجھے جل تھل کرے کوئی

.....

اداسی کی فصل اس کے جہان کو ویران اور دل درد سے آباد کر دیتی ہے تو اپنوں کی مہر و وفا اس سے دسترس کی دوری میں کہتے ہیں کہ:

بہت مانوس ہوتے ہیں در و دیوار انساں سے
مکیں جب چھوڑ جائیں تو مکاں خاموش رہتے ہیں

.....

"پیار کی پہلی بارش" دشتِ جنوں کی بادیہ پیمائی ہے یا ہمارے گم شدہ خوابوں کا جزیرہ، سوز دروں ہے یا نغمۂ بالست۔ یہ تو "من کی باتیں" ہیں، ہم "تن والے" کیا جانیں لیکن کوئی تو ہے کہ نگاہوں سے لپٹ لپٹ گئی ہے۔ جبھی تو وہ کہتا ہے:

بچپن گزارا میں نے کڑی دھوپ میں بہت
چہرے پہ اب تو پیار کا آنچل کرے کوئی

.....

جب دشتِ بے اماں میں کڑی دھوپ کا سفر آبلہ پا بن جاتا ہے تو دھمال ڈالتی آرزوؤں کو لمحۂ وصال کا شجر سایہ دار "ماں" کے وجود میں ملتا ہے۔

شوکت کسی بھی گھر میں جو ماں کا وجود ہو رہتی ہے اس میں چھاؤں شجر کے بغیر بھی

.....

تخلیقِ فن، دراصل اظہارِ خواب ہے۔ خواب جاگتے ہوں تو خواب دیکھنے والی آنکھیں اور خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے والے

لوگ ''انعام یافتہ'' بن جاتے ہیں۔ وہ خود تنہا، ہجوم میں اجنبی کی طرح تنہا ہوں مگر تگ و تاز میں کسی نئی منزل کا سراغ پا لیتے ہیں۔ نئے افق تلاش کرتے ہیں تو وہ دور ہی سے پہچانے جاتے ہیں۔ اور ایک جہان ان کے جلو میں ہم رکاب ہو جاتا ہے۔ افتخار شوکت نے غزل کو مضامینِ نو سے عصری تجربات و مشاہدات سے آشنائی دی ہے۔ شعر کو گل و بلبل کے سحر سے آزادی دلانے والے معاصر تخلیق کاروں میں ان کا نام بھی ہے۔ ان کا کلام، ان کی شخصیت کا پرتو ہے۔ فکر رواں، دواں اور جاوداں ہے، جمود کا شکار نہیں - سادگی، صفائی اور روانی، وہی موضوعات میں داخلیت اور خارجیت کا سلجھا ہوا توازن۔ استعارات اپنی غزل کے نہیں، اپنی مٹی سے کشید کیے ہیں۔ کہیں کہیں ،خوش طبعی کی جگہ کشیدہ حالات و واقعات کی تلخی نمایاں ہے۔

میں کسی کی آنکھ سے سر سبز تھا
میں کسی کی بات سے پیلا پڑا
جسم پر میرے دراڑیں پڑ گئیں
غصہ مجھ کو روز ہی پینا پڑا
تھا سفر میرا خود اپنے آپ سے
اس سفر میں بھی مجھے دریا پڑا

افتخار شوکت کی پروازِ فکر اور ندرتِ افکار نے غزل کو تنگنائے نہیں رہنا دیا۔ غزل کی پراگندہ خیالی اور داخلی انتشار، غزل کے مضامین کو بے حد و کنار بنا دیتی ہے مگر افتخار شوکت کے جی میں کیا آئی - کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے۔ بیالیس نظمیں ''محبت روشنی ہے'' کے سرِ عنوان سے منظرِ عام پر لے آئے۔ یہ آزاد نظمیں ہیں۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ بے چہرہ، سپاٹ اور راست بیانیے والی شعریت و غنائیت سے تہی، برگشتہ کر دینے والی نثری نظمیں نہیں۔

ان نظموں میں تازہ کاری کا ہنر ہے۔ کلام میں صفائی ہے کہ ابلاغ اپنے تمام حُسن کے ساتھ جلوہ ریز ہے۔ نظموں میں دردمندی کا جوہر بھی ہے اور اظہار میں سلیقہ شعاری بھی۔ فزکس کی ایک تھیوری ہے کہ ان پُٹ نہ ہو تو آؤٹ پُٹ نہیں ہوتا - شاعری سائنس کی تجربہ گاہ نہیں ہے کہ ایک ہی فارمولے سے نتائج سامنے آئیں اور نہ ہی یہ تھانے میں درج ایف آئی آر ہے کہ اس کی حدود سے باہر جوہرِ وکالت نہیں چمک سکتے بل کہ یہ تو احساسات ہیں جو الفاظ کا جامہ پہن کر شعر کا روپ دھار لیتے ہیں افتخار شوکت نے اپنی نظموں میں عصری حسیت کو زیادہ اہمیت دی ہے کہ یہ رجحان مابعد

جدیدیت ہی کی کڑی ہے۔

کوئی زمانہ ہو، کوئی عہد ہو، حالات و واقعات کچھ بھی ہوں، عشق و محبت ہمیشہ ادب کے آفاقی اور کلاسیکی موضوعات میں سے اہم ترین موضوع رہا ہے۔ یہ آج بھی اسی طرح سکہ رائج الوقت ہے جیسے میر و سودا کے دور میں تھا۔

محبت روشنی ہے، محبت، محبت دو دلوں کے درمیان، چلو اس کو منالیں، ہم، تم میرے ہاں تم میرے ہو، خفا نہ ہونا، آنکھیں، تم جو آنکھ اٹھا کر دیکھو، مجھے آواز دے لینا، کبھی آؤ۔ یہ سارے ان نظموں کے عنوان ہیں۔ دوری اور مجبوری کا تجربہ ہو، بیان ہجر و فراق کا ہو یا خواہشِ وصل کا، وہ لطافت و متانت سے پیوستہ رہتا ہے۔ اس مجموعہ کی آخری نظم کو میں صرف اپنی مذکرہ بالا گفتگو کی تائید میں شامل مطالعہ رکھتا ہوں۔ عنوان ہے "تلافی"

کہیں تم ہو
کہیں میں ہوں
یونہی یہ زندگی
بیکار بے مقصد
گزرتی جاتی ہے آؤ

.....

ابنِ آدم ہونے کے ناتے افتخار شوکت بخوبی جانتا ہے کہ ابوالبشر کی تسکین کے لیے پروردگار عالم نے پن گھٹ کے سندر گیتوں کی طرح، بیوی عطا فرمائی پھر وہ اولادِ آدم کے لیے "ماں" بنی۔ ہم ماں کے قدموں میں جنت ڈھونڈتے ہیں۔ یہ بہت اچھی بات ہے مگر اس سے بُری بات یہ ہے کہ ہم دورِ جاہلیت میں ابھی تک رہ رہے ہیں، اسی وجہ سے بیوی کو پاؤں کی جوتی ہی سمجھتے آئے ہیں۔ لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے جس عورت کا ہاتھ ہوتا ہے، ضروری نہیں کہ وہ صرف ماں ہی ہو، بیوی بھی ہو سکتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ پیار کی پہلی بارش کا "انتساب" دخترِ عزیز از جاں "مہرین افتخار کے نام" ہے۔ یہ انتساب معنی خیز ہے۔ چونکہ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ "اکائی" ہوتا ہے اور اکائی کی یکتائی بیوی کی مرہونِ منت سے "غزلیں تیری آنکھوں جیسی" معرضِ وجود میں آتی ہے۔ حمد، دعائیہ، محبت روشنی ہے، محبت، محبت دو دلوں کے درمیاں، ماں، نسبت، اپنی بیٹی مہرین افتخار کے لیے، میں ارتباط حسن رویتی اور فرضی نہیں، حقیقی ہے۔ نسبت (شریکِ حیات آسیہ افتخار کے لیے) نظم میں افتخار شوکت اس ارتباط کے مختلف مدارج کا تذکرہ ایسی سچائی سے کرتا ہے

کہ سپردگی اور رفاقت کی کیفیت پر دل والے
جھوم اُٹھتے ہیں:

خالی جیون کے خاکوں میں
تم نے آ کر رنگ بھرے ہیں
میرا ہر اک سپنا
تم نے ہی تعبیر کیا ہے
تم سے مل کر یہ جانا
تقدیر کیا ہے
ایک فریم کے اندر ہم کو
قدرت نے تصویر کیا ہے
گھر میں جتنی بھی آرائش کر لوں
میرے گھر کی زینت تم ہو
تمھارے حوالے مجھ سے جڑے ہیں
میری ہر اک نسبت تم ہو

.....

ماں اور بیٹی پر تو بہت سے شاعروں نے خامہ فرسائی کی ہے مگر اپنی بیوی کے بارے میں اکثر اوقات معاشی مسائل کا ہی شکار رہے ہیں:

محبت ہی محبت کہہ رہے ہیں ہم
فلک دشمن نہیں اپنا
زمیں دشمن نہیں اپنی
فقط انسان ہی انسان کا دشمن
ہے صدیوں سے
کہیں مذہب
کہیں پر رنگ کی تقسیم قائم ہے
کہیں پر نسل کی تفریق دائم ہے
کہیں نعرہ وطن کا ہے
حقیقت اور ہی کچھ ہے
سبھی جھگڑوں کے پیچھے
مسئلہ سارا معاشی ہے

.....

ہم اکثر کہتے رہتے ہیں کہ ہم زود فراموشوں کے درمیان عہدِ ناپُرساں میں سانس لے رہے ہیں۔ دیگر شعبہ ہائے زندگی سے بھی زیادہ علم و ادب کا کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ خاص طور پر شاعری کو تو ایک کارِ زیاں شمار کیا جاتا ہے۔ ایسے میں اگر کچھ لوگ شعر و سخن کا چراغ روشن کیے ہوئے ہیں تو ان کی اس کوشش کو سراہا جانا چاہیے۔

علی رضا قدیم زمانے کا جدید انسان ہے، جہاں اقدار زندہ ہیں۔ ورنہ ہم جیسے کم کوش لکھاری جو اچھی کتاب کے مطالعے سے اپنی شخصیات کو نکھار سکتے ہیں، محروم ہی رہتے ہیں۔ افتخار شوکت خوش قسمت شخص اور خوش قامت شاعر ہے کہ اپنے جم پل ساہیوال سے سکونت ترک کرنے کے باوجود شام دوستاں میں دل کا نگر ہے ورنہ شہر کی مٹی تو اس طرح کھا جاتی ہے کہ لوگوں کے حافظے سے ہی اُتر جاتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

[ظفریات] کتاب سے قلم کا سفر

پنجابی میری رُوح اور اردو میرے جسم کی زبان ہے اس لیے دل و دماغ کی باتوں نے انہی زبانوں کا لباس پہنے رکھا میں نے جتنا بھی ادب پڑھا انہی زبانوں کا پڑھا جو خود میں سماتا محسوس ہوتا ادب کی طالب علمی روح کا وہ پسندیدہ عمل ہے کہ اس میں کسی منزل پر پہنچنے کی جلدی نہیں ہوتی یہ سفر ہی اتنا خوبصورت ہے کہ راستے ہی بہت کچھ نواز دیتے ہیں کتابوں کی دوستی نے مجھے تصوراتی دنیا کی وہ سیر کروائی جس نے میری تنہائیوں میں رنگ بھرے مجھے خوبصورت سوچنے بولنے لکھنے کے جہاں کا بندہ بنایا میرے اندر دنیا کی دولت عہدوں کا دھوکہ ہی ختم کر دیا میں اُس امیری کے احساس میں رہنے لگا جو روپے پیسے سے نا خریدے جانے والے منظروں کا نظارہ تھی جیسے کسی فقیری کے مقام پر پہنچنے والے کو قدرت اپنی پوشیدہ تخلیق سے ملواتی ہے اور ظاہری بے زبان تخلیق سے باتیں کرواتی ہے اسی محسوسات نے مجھے ادب کا وہ عاشق بنایا جو کتابوں کے راستوں پر مطالعے کی چہل قدمی کرتے کرتے اُن شخصیات کے مقام واقفیت پر پہنچا جو اپنے منفرد روشن اعمال سے رُوحانی مقام ادب پر فائز ہوئے جن کے بارے میں دل شدت سے چاہتا کہ کاش مجھے اُن کے دور حیات میں جینے کا موقع ملتا تو میں عقیدت کے آنسوؤں سے اپنا دامن بھگو کر اُن کے جوتے صاف کرتا جیسے قدرت نے عزت بخشی ہو اس کی عزت کرنا اپنی عزت میں اضافے والی بات ہے۔ میں کتابوں کا احسان مند ہوں کہ انھوں نے مجھے قدرت کے خوبصیرت عاشقوں پر نوازشات کے حالات پڑھوائے ان کے حالات زندگی نے اپنی حیات سنوارنے میں نہ صرف مدد کی بلکہ انسانی زندگی کا معیار بھی بتلایا دنیا کی ہر اچھی

ظفر اقبال ظفر

کتاب آسمانی کتابوں کے معیار کی گواہی ہے لوح و قلم کو پیدا کرنے والا رب سب سے پہلا لکھاری ہے اور دنیا میں سب سے پہلے لکھاری حضرت ادریسؑ ہیں جن سے قلم و کتاب کا سلسلہ شروع ہوا جبکہ لکھاری ہونا اُس رب کی سنت ہے جس نے عالم ارواح سے آخرت تک انسانی حیات کے سفر لکھ رکھے ہیں اچھی کتابیں اپنی برکت کے سبق لکھوا کر کتاب پیدا کرتی ہیں کتاب وہ چراغ ہے جس کی روشنی تاریک ذہنوں میں سماتی اور سوچوں کی زبان کے ذریعے نمودار ہوتی ہے جیسے پڑھانے کے لیے پڑھنا ضروری ہے ایسے ہی لکھنے کے لیے بھی پڑھنا ضروری ہے میں اپنی تحریریں ایک معروف اخبار کے ایڈیٹوریل ایڈیٹر کو بھیجا کرتا تو وہ شائع نہ کرتے میں نے ایک دن ان سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو کہنے لگے آفس آ جائیں میں اسی دن کے انتظار میں تھا میں جب پہنچا تو کہنے لگے تحریریں اپنے معیار کی خود گواہی دیتی ہیں آپ کے کالم اس لیے نہیں لگتے کہ آپ میرا ادب کرتے ہیں عزت پیار دیتے ہیں مجھے حق نہیں پہنچتا کہ آپ کا فائدہ نہ کر سکوں تو نقصان بھی نہ کروں تمہاری تحریر اسی حالت میں شائع کر دیتا تو مارکیٹ میں تمہارے قلم کا معیار متعارف ہوتا جیسے کوئی بھی اخبار شائع کرنے سے گریز کرتا آپ کی تحریروں میں جذبات احساسات تو ہیں مگر ان کو پالش کرنے کی ضرورت ہے الفاظ کا چناؤ سلیقہ ترتیب آغاز سے اختتام کی جانب کا بہاؤ حاصل تحریر سے قاری کو مستفید کرنا گویا انھوں نے میری تحریر کی نبض سے اندازہ لگایا اور مجھے دو وزن کتابیں لکھ دیں جو میں نے فوری خریدیں اور مطالعہ شروع کر دیا ان کتابوں نے میری قلمی اصلاح میں استادوں کا کردار ادا کیا پھر میری تحریروں کو بڑے اخباروں میں کالم اور سنڈے میگزین میں فیچر کی اشاعت کا مقام ملا ایک دفعہ انبیاءؑ کرام کے حالات زندگی سے ایمان تازہ کرنے والی تحریر تیار ہوئی میں نے معروف اخبار کے میگزین ایڈیٹر کو میل کی اُس نے پڑھی اور مجھے وائس میسج کیا کہ آپ اسلامی نہ لکھا کریں کسی بھی دنیاوی پہلو پر بھیج دیا کریں مجھے بہت افسوس ہوا کہ مسلمان ملک مسلمان اخبار مسلمان ایڈیٹر پھر اسلامی فیچر سے کنارہ کشی کیوں؟ میں نے اللہ سے دُعا کی مالک تو نے جب بھی لکھوایا ہے عطا سے لکھوایا ہے میری کوئی تحریر اشاعت سے محروم نہیں رہی اور اس تحریر سے تو میرے مذہبی جذبات جڑے تھے مالک میرا لکھنا اگر تجھے پسند نہیں تو میرے دل میں اتار دے میں قلم کو ہاتھ نہیں لگاؤں

گا اور اگر تو نے پسند کیا ہے تو اسے بندوں کی بھی پسند بنا دے۔ اس دعا کے بعد ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ وہی تحریر ہندوستان کے پنجاب میں ایک ہندو ایڈیٹر کے ہاتھوں ہندو اخبار میں گرمکھی زبان میں شائع ہوئی یہ سلسلہ آج تک وسعت کے ساتھ جاری ہے میں نے آسمان کی طرف ہاتھ جوڑ کر خدا کا شکریہ ادا کیا ایک لفظ بھی میری تخلیق نہیں ہے اور میں قلمی قبیلے کا حصہ ہوں میرے لیے یہ ایسے ہی ہے جیسے خدا نے گندگی کے ڈھیر پر اپنی رحمت کی سفید چادر ڈال کر پردہ پوشی کر رکھی ہے جسے لوگ اوپر سے دیکھتے خدا کی عطا سمجھتے ہیں اور میں خود کو اندر سے دیکھتے ہوئے خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔

حساس دل بہتی آنکھیں وجود پر احساسات و محسوسات کی کیفیت ذہن میں تصورات کی بوچھاڑ نہ چاہتے ہوئے بھی خیال اور گمان کی دنیا میں کھوئے رہنا یہ لکھاری ہونے کا اعلان ہی تو ہے سیدھے سادے الفاظ میں معنی کا رش قلم اور ذہن کا صحیح رابطہ تحریر کو دلچسپ بنا دیتا ہے جیسے تحریریں آپ کے ذہن میں تصویریں بناتی ہیں ایسے ساری کائنات کی تصویریں اُن گنت تحریروں سے لبریز ہوتی ہیں قدرت کی ہر تخلیق اپنے اندر کئی کتابوں کا علوم اور راز رکھتی ہے پڑھنے والی آنکھیں ہوں تو ذہن خود حقیقتیں تراش کر نکال لیتا ہے قدرت اپنے لکھاریوں سے اپنی تخلیق کے پوشیدہ رنگ روپ دکھا کر منظر کشی کا سلیقہ دے کر زندہ رہنے والی وزنی تحریریں لکھواتی ہے جسے تاریخ بھی کہا جاتا ہے میں غربت سے مڈل کلاس میں آیا ہوا مزدور انسان ہوں قلم و کتاب سے رشتہ رب نے جوڑ تو دیا ہے مگر ایسے حالات بھی دے رکھے ہیں کہ اپنے اہلِ خانہ کا رزق حلال خاردار جھاڑیوں سے چھڑواتے روز ہاتھ اور دماغ زخمی کر کے گھر لوٹتا ہوں اس لیے میرا قلم اتنا زرخیز نہیں کہ میں خط لکھنے بیٹھوں اور کتاب لکھ دوں اور کئی بار قدرت ایسے ہنسی مذاق بھی کرتی ہے کہ مزدوری کرتے ہوئے انمول تصور سونپتی ہے اور جب کاغذ قلم لے کر بیٹھتا ہوں تو سوچیں الجھا دیتی ہے اور خالی کاغذ کے ساتھ ہی سونا پڑتا اور کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ ذہن ایسے منظر روشن کرتا کہ قلم اور تحریر میں ایسا سلجھاؤ ہوتا کہ کہیں فکر و خیال کا ٹکراؤ نہیں جیسے قدرت بات بنا بنا کر دے رہی ہے اور مجھے بس لکھتے جانا ہے اک عرصہ میں نے ادب کو سینے سے لگائے رکھا لیکن جب ادب نے مجھے سینے سے لگایا تو انداز بیان بدلنے لگا اسلوب نے بسیرا کیا دلکش اور دلچسپ کیفیت کا ساتھ ملا بیدار دماغ اور محسوسات سے دل بھر گیا شاید یہی وجہ ہے کہ میں نے کبھی قلم سے وہ تحریری

تیزاب نہیں مانگا جو معاشرے کے داغ دھونے کے نام پر مزید زخم سونپ دے بلکہ دل وروح میں اس احساس کو اجاگر کرنا ہے کہ ہر انسان اپنی سوچ کی خوشبو سے انسانیت کا گلشن خوشگوار بنا سکتا ہے اور فطری طور کا ہر لکھاری ایسی ہی قلمی طاقت چاہتا ہے جو عوام کو بیدار کرے میں جانتا ہوں کہ میری تحریروں اور گفتگو میں وہ اسلوب نہیں جو اعلیٰ درجے کے لکھاریوں کے قلم وزبان میں ہوتا ہے اور ان لفظوں میں اگر کہیں کوئی روشنی ہے تو وہ کتاب کے چراغ کی بدولت ہے میرے حالات ایسے ہیں کہ کسی استاد کو شاگردی کے لیے وقت دے سکتا اور نہ ہی وقت نے مجھے کوئی ایسا استاد دیا میں کتابوں میں استادوں کو ملتا رہا ہوں جس میں دو طرفہ پردہ پوشی رہتی نہ میرے عیب کسی استاد پر عیاں ہوتے جو میری جہالت دیکھ کر صحبت کا دروازہ بند کر دیتا اور نہ مجھے استاد کے کتابی حسن کے علاوہ کوئی روپ دیکھنے کو ملتا کہ جس سے لکھاری استاد کی عظمت متاثر ہوتی میرے لیے کتاب ہی استاد رہی یوں محسوس کرتا کہ لکھاری استاد مجھے اپنا اچھا تحریری مواد پڑھا رہا ہے اور میں اچھا پڑھ کے اچھا لکھنے کی کوشش کرتا کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ کتاب کے کسی جملے نے مجھے پھول کا احساس دیا جسے کاغذ پر اتارا تو پورا مضمون ہی خوشبودار ہو گیا اس کے باوجود مجھے مکمل ہونے کے لیے استاد کی تمنا رہتی ہے کیونکہ اب مرتے دم تک مجھ میں قلم کشی کا ذوق زندہ و بیدار رہے گا۔ کاغذ قلم کتاب تو دنیا کے بازار سے مل جاتے ہیں مگر تصورات کی تخلیق تو قدرت کے جہانوں سے عطا ہوتی ہے اور استاد بھی اسی جہاں کی ایک نعمت ہے میری رُوح کی طلب تاخیر کے صبر سے پیغام دیتی ہے کہ جس دن قلبی ذہنی پیاس بجھانے کا ادبی چشمہ استاد کی صورت میسر ہوا تو میرے قلم کو وہ کاسہ بنا دے گا جس سے میرے جیسے اور پیاسے ذہن بھی سیراب ہوں گے قدرت کے نوازے لکھاری استاد پرستی کا سلوک طالب علموں سے رکھتے ہیں یہی ان کی سخاوت اور فضیلت کا اثر ہوتا ہے اگر طالب علم دنیاوی خواہشات یعنی شہرت اور مالی غرض سے پاک انداز حیات رکھتے ہوئے فقط ذہنی اُجالوں کا اجر کمانے کی نیت رکھتا ہو تو سنجیدگی میں شگفتگی اور چپ میں فکر کے اثرات جھلکنے لگتے ہیں مطالعے کے چراغ سے تحریر کی راہیں تو روشن ہو جاتی ہیں مگر اچھے یعنی مہربان اور رُوحانی لگاؤ رکھنے والے استاد کا ساتھ نصیب ہو تو ایسی تحریریں وجود میں آتی ہیں جو دماغوں پر نہیں دلوں پر اُتر جاتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

کشمیر کی بیٹی اور ایک سرمایہ فکر شاعرہ.... شاہدہ لطیف

جدید شاعری کئی حیثیتوں سے قدیم شاعری سے مختلف ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیات عاشقانہ مضامین ومعروضات اور تخلیقات کے بجائے حقائق اور واقعات کی ترجمانی کرنا ہے۔ قومیت، حُب الوطنی جذبہ کا احساس اور آزادی کی روح جدید شاعری کا سب سے بڑا وصف ہے۔ اُردو شاعری میں یہ تصور بالکل نیا ہے اور مغربی ادب کے اثرات کا نتیجہ ہے ان تصورات اور نظریات کی ترجمانی نے ہماری شاعری کو قومی اور ملکی خصوصیات کا آئینہ دار بنایا۔ آزادی کی تحریکوں کے ساتھ ساتھ جدید اُردو شاعری میں آزادی کا احساس روز بروز شدت اختیار کر گیا۔ یوں ملکی اور سماجی مسائل پر کھل کر اظہار خیال کیا جانے لگا۔ جس سے جدید شعرا نے اپنے کلام کی بدولت عوام الناس کے دلوں میں اُمید کا دیا روشن کیا، ان کو زندہ رہنے کا حوصلہ دیا اور آگے بڑھنے کا راستہ دکھایا تاکہ قوم اپنی عظمت رفتہ کو حاصل کر سکے لیکن آگے چل کر اس میدانِ شعر و سخنوری میں ایسے بھی لوگ سامنے آئے جنھوں نے اپنی روایت، مذہب، تہذیب وتمدن اور اخلاق کو اپنی شاعری میں بڑی توانائی اور شدت جذبہ واحساس سے بھرپور انداز میں پیش کیا۔ جن میں محترمہ شاہدہ لطیف کا وجود روشنی کے اُس ستارے کی طرح ہے جس کی روشنی آسمان کے کئی ستاروں میں سب سے زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ اس حوالے سے کچھ محترمہ کے بارے میں جمیل یوسف لکھتے ہیں کہ ”یہ روشنی اُن خواتین کے لئے چراغ راہ ہے جو اپنے جائز انسانی اور مذہبی حقوق کے لئے جہاد کر رہی ہے، جو ظلم و تشدد کے خلاف آواز اُٹھانا چاہتی ہیں۔ خواتین کی شخصیت کو مسخ کر دینے والے گھٹن اور بہتر ذہنی صلاحیتوں کے باوجود خواتین کو مردوں کے مقابلے میں

صدام ساگر

کم سطح پر زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دینے والے ناروا اور بے جواز جبر کے خلاف جو خواتین آواز اُٹھا رہی ہیں ان میں محترمہ شاہدہ لطیف پیش پیش ہیں وہ خود اپنی مثال سے اپنی تحریر و تقریر سے اور اپنی شاعری سے اس تحریک کو حوصلہ اور عزم عطا کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔"

محترمہ شاہدہ لطیف کی زیرِ نظر تصنیف "معرکۂ کشمیر ایک ایسی لازوال کاوش ہے جس میں انھوں نے مقبوضہ کشمیر پر ظلم و تشدد کے خلاف برسرِ پیکار ہو کر اپنے جذبات کو لفظوں کی مانند صفحۂ قرطاس پر اُتارنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ تاکہ بھارتی ظلم و ستم کی آگ میں جلنے والی قوم کو ان کی غلامی کی زنجیر سے ہر ممکنہ نجات دلا کر انہیں اپنی مرضی سے اس دھرتی پر جینے کا حق مل سکے۔ جس کے لیے شاعرہ نے حق و باطل کا پردہ فاش کرنے کے لیے اپنی شاعری میں اس بات کا حقیقی معنوں میں ذکر اپنے اشعار میں کچھ یوں بیان کیا ہے کہ:

حساس ہے جو دل وہ تڑپتا ہے ظلم پر
جو آنکھ جبر دیکھتی ہے اشکبار ہے
کب اُن نہتوں کو ملا رائے دہی کا حق
بھارت کی فوج جن کے سروں پر سوار ہے

.....

محترمہ شاہدہ لطیف کی شاعری کا سب سے اہم حصہ ان کی انقلابی نظمیں ہیں جس میں امن کا پیغام، آزادی کا گیت، کشمیر ہماری جان، پاکستان کا رشتہ، روشنی کے مسافر، اب تو سوچو، محاذِ جنگ، ماں کی فریاد اور سری نگر سے خط کے علاوہ دیگر ایسی نظمیں "معرکۂ کشمیر" میں شامل ہیں جنھیں پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعرہ نے اپنے دور کے ہیجان کی مکمل ترجمانی کی ہے۔ محترمہ بنیادی طور ایک سرمایہ فکر شاعرہ ہیں۔ اس لیے ان کے تصورِ انقلاب میں بھی رومانیت جھلکتی ہے۔ محترمہ کے دل میں وطن سے اور کشمیر کے مسلمانوں سے والہانہ محبت کا جذبہ موجزن ہے اور اس کی ایک ایک چیز سے ان کو لگاؤ ہے۔ وہ جب کشمیر کے مسلمانوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا دیکھتی ہے اور عوام کو سیاست فرنگ کے جبر و استبداد کے پنجے میں گرفتار پاتی ہے تو ان کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور ان کے بیان میں شدت اور تیزی پیدا ہو جاتی ہے بل کہ وہ ان حالات کو پیش کرتے ہوئے دکھی ہو جاتی ہے۔ "معرکۂ کشمیر" بھی ان کے دوسروں کے پالے ہوئے دکھ کی داستان ہے۔ جس میں وہ اس دُکھ کو پرایا نہیں بل کہ اپنا سمجھ کر جھیلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس

کتاب میں سردار محمد عبدالقیوم خان، میجر جنرل سردار محمد انور خان اور ڈاکٹر رشید نثار کی آرا کی ساتھ ساتھ اعتبار ساجد کا دیباچہ بھی پڑھنے کو ملتا ہے جس میں وہ شاہدہ لطیف کی اس کاوش کو انقلاب آفریں معرکہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''معرکۂ کشمیر'' حق و باطل کا ایک ایسا شعری اور تخلیقی آئینہ ہے جس میں پاکستان کی بیٹی شاہدہ لطیف نے تمام عوامل و عناصر یکجا کر دیئے ہیں جو کسی مظلوم، آزردہ اور انصاف طلب خطے کے پیکر میں نمایاں خدوخال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کے مطالعے کے بعد ہر حقیقت پسند قاری کے دل سے کشمیر کے منصفانہ حل اور شاہدہ لطیف کی حیات جاوداں کے لیے بے ساختہ دُعا نکلے گی۔''

''لہولہو کشمیر'' ان کی ایک ایسی خوبصورت اور بھرپور نظم ہے جو بھارت سمیت دنیا بھر کے ریاستوں کو کشمیر کی صورت حال کو دیکھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

انگاروں میں سُلگ رہی ہے جنت کی تصویر
دُھواں دُھواں ہے آزادی کے خوابوں کی تعبیر
اس عالم میں کیوں کر ہو گی انساں کی توقیر
دیکھ ذرا کشمیر
لہولہو کشمیر

اس طرح کی نظموں کو تخلیق کرنا عموماً بہت مشکل طلب کام ہوتا ہے۔ مگر جس طرح سے محترمہ شاہدہ لطیف نے اس کام کو انجام دیا ہے وہ یقیناً ان کی کئی صدیوں کی مشقت اور ریاضت کا صلہ ہے۔ کیونکہ محترمہ کے اس شعری آہنگ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس بات کا بار بار خیال آتا ہے کہ ہماری کتنی شاعرات نے اس موضوع کو موضوع کتاب کی حیثیت سے دیکھا اور پرکھا ہے تو میرے خیال میں ایسی شاعرات بہت کم ہیں جنھوں نے الگ سے منظومات کی کتاب کشمیر کے حوالے سے نذر قارئین کی ہو۔ اس لحاظ سے محترمہ کو خصوصی امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے پاکستان کے شہر اسلام آباد میں مقیم رہ کر کشمیر کے درد کو کشمیر کی بیٹی کی طرح محسوس کیا اور ''معرکۂ کشمیر'' کی صورت میں اس کتاب کو شائع کیا۔ ان کی اس شاعری مجموعہ میں حمد، نعت، غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ ان کی اس کاوش کو سید عارف عالمی ضمیر پر طمانچہ قرار دیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ''شاہدہ لطیف کی کتاب بھارتی استبداد کے ساتھ ساتھ سوئے ہوئے عالمی ضمیر پر ایک زبردست طمانچہ ہے کشمیر کے موضوع پر شاہدہ لطیف نے بہت اچھی اور پُرتاثیر شاعری کی ہے۔''

غرضیکہ محترمہ شاہدہ لطیف نے ''معرکۂ کشمیر''

لکھ کر اُردو شاعری کو نیا انداز اور فنی شعور دیا ہے جس کی جدید شاعری کے ارتقا میں بڑی اہمیت ہے۔ انھوں نے اُردو شاعری کو بے باکی، والہانہ پن اور جدت عطا کی ہے اور ان کے ایسے ہی کچھ اشعار نذرِ قارئین حاضر ہے۔

شدت تھی قتل گاہ میں اپنے عروج پر
سارے چراغ خود ہی سرِ دار جل اُٹھے

☆

ہیں وفا کے نام لیوا خیمہ زن کشمیر میں
ہے جنھیں کرب و بلا سے رات دن کا واسطہ

☆

آنچ اُٹھتی ہے خیالوں کے الاؤ سے بلند
شاہدہ اب مرا ہر حرف سخن جلتا ہے

☆

کیسی ہیں کشمیر کی گلیاں، کوچے اور بازار سبھی
جنت کو میں لمحہ لمحہ مٹتے دیکھی جاتی ہوں

''معرکۂ کشمیر'' کے علاوہ ان کی متعدد تصانیف میں ''معجزہ''، ''میں پاکستانی ہوں''، ''برف کی شہزادی (منظوم سفر نامہ''، ''محبت ہو نہ جائے''، ''اُف یہ برطانیہ (منظوم سفر نامہ)''، ''بیت اللہ پر دستک (منظوم سفر نامہ)''، ''نگاہ مصطفےٰ (نعتیہ مجموعہ)'' اور ''خواب سونے نہیں دیتے'' جبکہ ''حکایات کا انسائیکلوپیڈیا'' کے علاوہ ان کے کرنٹ افیئر پر مبنی مضامین کی کتب میں ''پاکستان میں فوج کا کردار''، ''امریکا، اسلام اور عالمی امن'' اور دو عدد نال کے مجموعوں میں ''سات قدیم عشق''، ''سلطان محمد فاتح'' اور شعبہ تعلیم کے متعلق '' Short stories & one act plays جو بی اے کی طالب علموں کے لیے ایک انمول تحفہ ہے - جبکہ تخلیص و ترجمہ کے حوالے سے ان کے ''دنیا کے 70 عجوبے'' شامل ہیں -اس کے علاوہ محترمہ ایک ادبی، ثقافتی، تعلیمی اور سیاسی مجلّہ ''اوورسیز انٹرنیشنل'' کی بطور مدیرہ اپنے صحافتی فرائز بھی سرانجام دے چکی ہے۔ یوں اس طرح آج محترمہ شاہدہ لطیف کی علم و ادب اور تاریخِ صحافت کے لئے خدمات گراں قدر ہیں اور ان خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جانا چاہیے انہیں ادبی اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں حکومتی سطح پر صدارتی اعزاز برائے حُسنِ کارکردگی سے بھی نوازا جا چکا ہے مگر یہ ان کی بے نیازی کا ثمر ہے کہ وہ اپنے ساتھ یہ لکھنا مناسب نہیں سمجھتی شائد اس لیے ابھی جو آنکھوں میں خواب ہیں اُن کی تعبیر ادھوری ہے جن کی وجہ سے انہیں ابھی تک ''خواب سونے نہیں دیتے''۔

☆☆☆☆☆

اردو غزل کے عصری رویے ایک تاثر

راہبر ہر دوسرا بس آپؐ ہیں، بس آپؐ ہیں
فخرِ خلقِ انبیا بس آپؐ ہیں، بس آپؐ ہیں

ابتدا تا انتہا ملتی نہیں جس کی مثال
وہ عطائے بے بہا بس آپؐ ہیں، بس آپؐ ہیں

بدل رہی ہے ہوا سب نشاں بدلتے ہیں
سو ہم بھی تجھ سے دلِ بدگماں بدلتے ہیں

کسی طرح سے دلِ خوش خیال راضی ہو
چلو نتیجۂ سود و زیاں بدلتے ہیں

نہ کاروں کا نشاں تھا نہ دشت میں خیمے
شجر تو بچھڑی جوانی میں چل کے آیا تھا

اُسے بھی شب کے فُسوں نے جکڑ لیا آخر
کبھی جو شام سہانی میں چل کے آیا تھا

سلگتی رُت ہے بہت پھڑ پھڑا رہے ہیں شجر
کہ دکھ زمیں کے اکیلے اُٹھا رہے ہیں شجر

کوئی بھی آس کی ڈالی ہری نہیں ہے یہاں
سو شہرِ حبس میں خود کو جلا رہے ہیں شجر

یہ کس جمال کی بخشی گئی ہے لہر مجھے
کہ دیکھتے ہیں غزالاں بھی آٹھ پہر مجھے

جو یادیں مسکرائیں تو بہاریں لوٹ آتی ہیں
چلیں ٹھنڈی ہوائیں تو بہاریں لوٹ آتی ہیں

سُنا ہے اِن رُتوں کا مستجابی وقت ہوتا ہے
سُنا ہے لب ہلائیں تو بہاریں لوٹ آتی ہیں

.....

ممتاز شاعر ڈاکٹر نثار ترابی کے شعری سرمائے سے یہ چند شعر بہ طور حوالہ درج کیے ہیں اس بات کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے کہ کس معیار کے تخلیق کار ہیں۔ نثار ترابی دور حاضر کے روشن فکر شاعر ادیب نامور نقاد اور محقق ہیں اردو ادب میں تحقیق اور تنقید کے حوالے سے ان کا کام نہایت اعلیٰ اور منفرد اسلوب کا حامل ہے۔ اردو غزل کے عصری رویے ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ صرف تحقیقی کام ہی نہیں بلکہ اردو غزل کے حوالے سے عہد بہ عہد ایک تاریخی

فرح سنبل

ادبی دستاویز بھی ہے انہوں نے عرق ریزی اور باریک بینی سے اس تحقیقی کام کو شگفتہ اسلوب کے ساتھ قاری تک پہنچایا ہے جو ان کی علمیت کا خاصا ہے مقالہ کی خوب صورت ابواب بندی کر کے غزل میں پیدا ہونے والے تمام عصری رویوں قدیم اور جدید کے تناظر میں اسلوبیاتی، موضوعاتی، جمالیاتی لسانیاتی، فکری اور فنی، کلاسیکی، رومانوی، سیاسی، سماجی معاشی، معاشرتی، ثقافتی، علامتی نظام، ترقی پسندی سائنسی، نسائی، حب الوطنی تصوفانہ، ظریفانہ، غرض یہ کہ غزل میں پیدا ہونے والے تغیرات کو نہایت مفصل بیان کیا ہے ان کی تحقیق غزل میں غیر جمہوری رویے، جمہوری جدوجہد آزادی کی تحریکوں کے علاوہ خصوصی طور پر نعت، سلام کربلا کا استعارہ، لسانیات، آزاد غزل، غزل مسلسل، سائنسی غزل، مکالماتی غزل کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے اس کے علاوہ انہوں نے غزل میں پیدا ہونے والے تخلیقی رویوں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

ان کے بقول!

"اب غزل عورتوں سے مردوں کے باتیں کرنے کا نام ہی نہیں مردوں سے عورتوں کا باتیں کرنا بھی ہے۔"

ڈاکٹر نثار ترابی کی یہ کتاب "اردو غزل کے عصری رویے" دور حاضر کی نایاب کتاب ہے انہوں نے غزل کے عصری رویوں پر بڑے عمیق اور دقیق انداز میں روشنی ڈالی ہے یہ کتاب اردو تحقیق و تنقید میں گراں بہا ارمغاں سے کم نہیں ہے۔

سارتر کا بقول!

"اگر آپ نے لکھنے کا پیشہ اختیار کر لیا ہے تو آپ میں سے ہر شخص ادب کے سامنے جواب دہ ہے۔"

ڈاکٹر نثار ترابی نے اس تحقیقی کام کو اتنی جان فشانی سے سرانجام دیا ہے کہ اپنا قلم بھی نثار کر دیا ہے ان کے اخلاص کا منہ بولتا ثبوت یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے اس تحقیقی کام کی تکمیل کے لیے اپنے ملک کے اہم کتب خانوں کی نہ صرف خاک چھانی ہے بل کہ بیرونی ممالک کے ادبی دوروں کے وسیلے سے بھی مطلوبہ مواد کے حصول کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی وہ اس سعی مسلسل کے سفر میں کامیاب و کامران ہوئے ہیں یہ نادر کتاب خصوصی طور پر ایم اے، ایم فل، اور پی ایچ ڈی سکالرز کے لیے بے بہا معلومات کا خزینہ ہی نہیں بل کہ ان کے لیے مشعل راہ بھی ہے۔ آخر میں دعا گو ہوں اللہ رب العزت ڈاکٹر نثار ترابی کو سلامت باکرامت رکھے وہ اسی طرح نایاب، منفرد کتب لکھتے رہیں اور ہم ان کی کتب سے استفادہ کرتے رہیں۔

☆☆☆☆☆

اجمل اعجاز: اپنی چند نگارشات کے آئینے میں

اجمل اعجاز ایک منجھے ہوئے افسانہ نگار، شاعر اور ڈرامہ نگار ہیں۔ ادبی حلقے میں انہیں افسانہ نگار کے طور پر جانا جاتا ہے لیکن یہ ایک حساس شاعر بھی ہیں۔ ادب میں ان کی پہچان افسانہ نگار کے طور پر ہوئی لیکن بعدازاں انھوں نے شاعری میں بھی طبع آزمائی کی۔ ان کی افسانہ، ڈرامہ اور شاعری پر متعدد کتب منظر عام پر آچکی ہیں۔ اجمل اعجاز کی اہم تصانیف میں اصلی خزانہ بچوں کے لیے ناول 1991 ایک محقق تین کتابیں منتخب افسانے 1992 بے لباس موسم، افسانے 1998 اس کا پنچھی، ڈرامے 2012، درد کا چاند، ڈرامے 2013، زرافہ اور لمبی لڑکی، افسانے 2015، زندگی اے زندگی وغیرہ شامل ہیں۔

یہ ایک سنجیدہ قلم کار ہیں جس کا اعتراف ادب کی اہم ادبی شخصیات نے بھی کیا۔

یوں تو ہر شاعر اپنی شاعری کو اصول سمجھتا ہے مگر میں اُس شاعر کی شاعری کو اہم جانتی ہوں جو شاعری کے مختلف مدراج بتدریج طے کر کے آیا ہو، شاعری کی خوبصورت روایتوں کا احترام کرتا ہو جو شاعری میں کچھ جدید کام کرنے کی اُسی حد تک کوشش کرے جس کی اجازت شاعری کے مسلمہ اُصول اُسے دیتے ہیں۔ جو اوزان و بحور کی پابندی کرنے والا ہو کیونکہ نثر کتنی ہی پُر تاثیر کیوں نہ ہو وہ شاعری نہیں ہو سکتی۔ ردیف و قوافی کی بعض بندشیں خود خیالات کو کھینچ کر شاعر کے نوک قلم تک لے آتیں ہیں اور اُن سے مفر ممکن نہیں ہوتا۔ ان کے مشاہدے، تجربے اور فکری اساس کی غمازی کرتا ہے۔ اس کتاب ”کوئی ستارہ اچھال“ میں شامل غزلوں کا بیانیہ فرد اور سماج کی ان مختلف صورتوں کو سامنے لاتا ہے جس سے ہم فرار تو حاصل کر سکتے ہیں۔ انکار ہرگز نہیں کر سکتے۔ یہ حقائق تو ہم سب شاعروں، ادیبوں کے سامنے کھلی کتاب کی صورت

کومل شہزادی

موجود ہیں مگر اسے اپنے احساس کا حصہ بنانا اجمل اعجاز جیسے حساس دل رکھنے والے شاعر کے حصے میں ہی آتا ہے۔

اجمل اعجاز کا پہلا حوالہ تو اگرچہ شاعری بھی ہے مگر ادبی حلقوں سے باہر عام لوگ انہیں افسانہ نگار کے روپ میں زیادہ پہچانتے ہیں۔

جس عہد میں ہم سانس لے رہے ہیں یہ عہد زندگی کا عہد نہیں ہے بس سانسیں چل رہی ہیں اور زندگی ہے۔ انسانی اقدار مٹی میں مل چکی ہیں کسی کو کسی سے کوئی سروکار نہیں سوائے مفاد کے زندگی کا ہر پہلو زوال پذیر ہے۔ شاعری ہو، افسانہ ہو یا ڈرامہ ہر شعبہ ہی روایتی ہو چکا ہے۔ اب محبت اور خلوص کے جذبوں کی جگہ ہوس نے لے لی ہے۔

کہتے ہیں شاعر کسی بھی معاشرے کا نمائندہ ہوتا ہے۔ وہ جو دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اسے لباس شعر پہنا دیتا ہے۔ جسے بعد میں ہر کوئی اپنی کہانی محسوس کرتا ہے یہ ہی ایک مکمل اور کامیاب شاعر کا فن ہے۔ برصغیر میں اردو شعر نے اپنے اپنے عہد میں بہت عمدہ اور مثالی کام کیا۔ اجمل اعجاز بھی قدیم و جدید شعرا کی صف کا وہ روشن شاداں تاباں ستارہ ہے جس نے معاشرے کی حقیقی تصویر کو شاعرانہ انداز کے ساتھ پیش کیا ہے ان کی غزل میں ایک خاص لطافت خاص لہجہ اور خاص قسم کی دھیمی دھیمی موسیقیت سوز و دلگداز اور منظر نگاری نمایاں ہے۔ اجمل اعجاز اچھے شاعر ہیں اتنے ہی اچھے انسان بھی ہیں۔ زیست کو گیرائی سے محسوس کرتے ہیں۔

زندگی سوز بھی ہے ، ساز بھی ہے
کچھ حقیقت ہے کچھ مجاز بھی ہے
مہلت عمر مختصر ہے بہت
شب غفلت ، مگر دراز بھی ہے
زندگی کا ہے راستہ پُر پیچ
کچھ نشیبی ہے ، کچھ فراز بھی ہے

.....

زندگی کا سفر کسی کا بھی آسان نہیں ہوتا اسے آسان بنانا پڑتا ہے کبھی جی کر اور کبھی مر کر۔ زندگی نشیب و فراز کا ہی نام ہے جس میں زوال و عروج آتے جاتے رہتے ہیں۔ اپنی انہیں کیفیات کو اجمل اعجاز شعر کی صورت اس طرح ڈھالتے ہیں کہ وہ عمدہ شاعری کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔

ہے سفر زیست کا کٹھن ، دشوار
روز جیتے ہیں ، روز مرتے ہیں
بن ہی جاتا ہے راستہ اعجاز
جس زمیں سے بھی ہم گزرتے ہیں

.....

ہماری زیست میں کچھ ایسے لمحات ہوتے ہیں جو تھکا دینے والے ہوتے ہیں لیکن

زیادہ تر لوگ ان لمحات میں ہمت چھوڑ دیتے ہیں لیکن کچھ اپنے دفاع میں لگے رہتے ہیں اور بار بار ہار کر بھی فتح یاب ہوجاتے ہیں -انسان کی زندگی میں کامیابی اُسی کی ہے جو مستقل مزاجی سے کام لیتا ہے۔

تھک کے ہوئے ہیں چُور، سفر بھی جاری ہے
دن تو گزر گیا ہے مگر رات بھاری ہے
نیرنگی حیات کے بس دو ہی رنگ ہیں
ہنس کر گزاری ہے کبھی، رو کر گزاری ہے

.....

ان کا شعری کلام رومانیت اور حقیقت کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ جہاں ان کے ہاں بہت سنجیدہ زندگی کے متعلق موضوعات ہیں وہیں رومانوی موضوع بھی ان کی شاعری کا خاصا ہے:

میرے عشق کی ایک عبادت
تیرے حسن کی مالا جپنا

اُس کی آنکھ کا ایک اشارہ
پھر کیا جینا اور کیا مرنا

.....

اجمل اعجاز افسانہ نگاری میں بھی ایک اہم مقام رکھتے ہیں ان کے افسانوی مجموعے بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔ان کا تازہ افسانوی مجموعہ ''زندگی کہانی ہے'' جس میں افسانے شامل ہیں۔ تمام افسانے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ان کے افسانوں کے کردار متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔اور یہ وہی کہانیاں ہیں جو مشرقی معاشرے کے روزمرہ مسائل ہیں - کچھ کہانیاں سماجی ناہمواریوں سے ہٹ کر بھی ہیں جس میں منفرد رنگ نظر آتا ہے۔اس منفرد افسانہ میں ہمیں ان کی منظر نگاری بھی عروج پر ملتی ہے۔

افسانہ ''دیواریں'' جس میں ایک وفا شعار اور سگھڑ بیوی کے اوصاف بہت خوبصورتی سے کہانی کی صورت میں بیان کیے گئے ہیں۔اس میں مہناز اس کا خاوند اور اس کا بیٹا فراز کے کردار ہیں۔ مہناز جو ہر مہینے اپنے میاں کی آمدنی سے چند پیسے بچا کر جوڑتی ہے۔اس افسانے میں یہ بتایا گیا ہے کہ اچھی بیوی کسی بھی گھر کو جنت بنا سکتی ہے۔ مہناز کے کردار میں ہمیں ایسی ہی خاتون نظر آتی ہے جو گھر کو پرسکون بنا کر رکھتی ہے۔

افسانہ کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''پہلی تاریخ کو جو تنخواہ مجھے ملتی ہے وہ ساری کی ساری میں مہناز کے ہاتھ میں تھما دیتا ہوں۔اس طرح میں مہینے بھر کے اخراجات کی ذمے داری سے بری الذمہ ہوجاتا ہوں''

افسانہ ''بدلیوں کے چاند'' جس میں تین افراد کی کربناک کہانی کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کہانی میں بھی دو اسباق ملتے ہیں ایک

وفادار بیوی کے جو اپنی زندگی اور صحت کو پس پشت ڈال کر مسلسل محنت و ملازمت کر کے اپنے میاں کا علاج کرواتی ہے۔
چھپا کر کردار مشرقی معاشرے میں ہمیں اپنے اردگرد بھی گردش کرتا نظر آتا ہے۔ جو مجبوری کے تحت اپنی عمر دوسروں کے سکھ کے لیے گزار دیتی ہے لیکن اس پر بد الزامات بھی لگا دیے جاتے ہیں جبکہ اپنی موت کے وقت وہ یہ الزام تراشی کو غلط ثابت کرنے کی اہل بھی نہیں رہتی۔ سریش کی بیماری کے لیے پانچ سال دوسرے شہر میں گوپال باپو کے ہاں ملازمت کرتی ہے۔ چھپا اپنی ماں کو خطوط بھی لکھتی ہے۔
اس افسانے میں ایک تنہا اور مجبور عورت کی بے بسی جو غربت کی ستائی جسے سکون میسر نہ آسکا۔ اس کردار کی اذیت ان الفاظ میں بھی محسوس کیے جاسکتے ہیں۔
""غموں اور تکالیف کو اپنی روح میں جذب کرتے کرتے اب وہ سراپا غم بن گئی تھی۔ ہر وقت کی کھانسی اور بخار نے اس کی صحت کو بگاڑ دیا تھا۔""
افسانے میں پہلے سریش کی بیماری سے مرنے کے بعد اس کی ماں بھی مرجاتی ہے لیکن چھپا کو خبر نہیں ہوتی۔ وہ پانچ سال بعد اچانک طبیعت ناساز ہونے سے ماں اور سریش سے ملنے واپس آتی ہے لیکن ٹرین کے بعد رکشے میں بیٹھ کر اپنے آشیانے تک پہنچنے سے قبل کی دم توڑ دیتی ہے۔ اس وقت ماں لاجونتی کی موت پر ہی سب جمع ہوئے ہوتے ہیں اور چھپا کی پہچان کے بعد سب اس پر ایسا بہتان لگاتے ہیں کہ ایک عورت کی روح بھی تڑپ جائے کہ وہ مجبوری اور وفادار بیوی کے طور پر منظر سے غائب رہ کر ملازمت کرتی رہی۔
""چار سال ہوئے پتی تڑپ تڑپ کر مر گیا اور اب ماں بھی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اسے یاد کرتی ہوئی چلی گئی ------ نہ جانے اب تک کہاں گل چھڑے اڑا رہی تھی---""
اس افسانے میں اجمل اعجاز کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے خطوط کی تکنیک استعمال کی ہے۔ یہ شاذ و نادر ہی ہمیں فکشن میں دیکھنے کو ملتا ہے۔
افسانہ ""خزاں کا پھول"" جس میں ایک فلسفی کا نظریہ عمدہ انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک فلسفی کے سوچنے کا انداز عام انسان سے مختلف ہوتا ہے۔
""وقت کا دریا زندگی کے نشیب و فراز کو روندتا ہوا گزرتا رہا میں اس کے اس اسکیچ کا منتظر تھا جس کے سہارے وہ مجھے سمجھانے کی ناکام کوشش کرنے والا تھا کہ پھول خزاں میں کھلتے ہیں، بہار میں نہیں۔""
اس افسانے میں ان کی منظر نگاری بھی

باکمال ہے۔ قاری کو پڑھتے ہوئے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اسی منظر میں سانس لے رہا ہے جو مصنف تذکرہ کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس مجموعے میں افسانے دس منٹ، اندھیرا، جال، پیر بابا کی دعا وغیرہ شامل ہیں۔ ہر کہانی منفرد ہے اور الگ پہچان کی حامل ہے۔

المختصر یہ منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں انھیں لکھنے کے ساتھ جذبات واحساسات کو عمدہ الفاظ میں ڈھالنے پر مکمل مہارت حاصل ہے۔ علاوہ ازیں افسانہ نگاری میں ان کا اسلوب نہ پیچیدہ تھا اور نہ ہی آسان تھا۔ کہانیوں میں ربط اور روانی ہے۔

اسد محمد خان جیسے اہم افسانہ نگار کی اجمل اعجاز کی افسانہ نگاری پر رائے ملاحظہ کیجیے:

"اپنی کہانیوں کے دائرہ وار طلسم کو ان کی گرفت کو۔۔۔ جو من موہنی بھی ہے اور لرزہ خیز بھی۔۔۔ پڑھنے والے کے کردار بھی مضبوط کرتے پھیلاتے رہو۔"

افسانہ نگاری کی طرح ڈرامہ نگاری میں بھی انھوں نے بے حد عمدہ ڈرامے قلمبند کیے۔ یہ ڈرامے پڑھنے کے بعد یہ رائے سے قارئین بھی اتفاق کریں گے کہ انھیں ڈرامے لکھنے پر بھی مکمل مہارت حاصل ہے۔ ان کا ڈراموں کا مجموعہ "بادل اور زمین" جو اکادمی بازیافت سے میں شائع ہوا۔ اس میں سات ڈرامے شامل ہیں۔ ان کے ڈرامے بھی ہمارے روزمرہ میں پیش آنے والے واقعات ہیں جو ہمیں اپنی زندگی میں درپیش آتے ہیں۔ ڈرامہ "زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے" جس میں مختصر کرداروں سے ایک اہم مخفی پہلو کو عیاں کیا ہے جس سے ہم دوچار ہوتے ہیں۔ اس ڈرامے میں ایاز کے کردار سے دکھی انسانیت کا پرچار کرنا نمایاں کیا گیا ہے۔ مرکزی کردار ایاز ایک ایسے ہسپتال میں ملازمت کرتا ہے جہاں نشے کے عادی افراد کو اس علت سے چھٹکارا کروایا جاتا ہے اور ایاز ان مریضوں ادویات دیتا ہے۔ یعنی اس کا کام انسانیت کی خدمت کرنا ہے اور وہ اسے خوش دلی سے کرتا ہے۔ ایاز کا کردار مرکزی ہے جس میں مثبت پہلو ملتے ہیں اسی طرح ڈاکٹر عامر کا کردار ویلن کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر عامر جیسے کردار ہمارے معاشرے میں مسیحا روپ بنا کر انسانوں کو ڈستے ہیں۔ ایک مسیحا آپ کی زندگی کو بچانے کی تگ ودو کرتا ہے جبکہ مشرقی معاشرے میں ڈاکٹرز جس طرح انسان کا استحصال کرتے ہیں اور انسانیت کو پاؤں کے نیچے روند دیتے ہیں۔ یہ مسیحا کے روپ میں جلاد ہیں جو انسانوں کی جان بچانے کا ڈرامہ کرتے ہیں اور انسانوں کی جان کے دشمن ہوتے ہیں

اسی طرح ڈاکٹر عامر جو اپنے ہسپتال میں مریضوں کو نشہ آور ادویات دے کر اُن کو نشے پر لگاتا ہے اور پیسے بٹورتا ہے۔ جلال جو اس ہسپتال میں یہ سب کروانے میں اس کا ساتھ دیتا ہے جو نشہ بیچتا ہے اور ان مسیحا کے ساتھ مل کر انسانیت کا قتل کرتا ہے۔ ایاز جو افسانے میں اصل مسیحا کا کردار ادا کرتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''ہم علاج کے ساتھ ساتھ بنیادی اسباب کو دور کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔۔۔ ایسے مریضوں کے دوستوں اور عزیزوں سے مل کر اس بنیادی سبب کا کھوج لگاتے ہیں جو اس لعنت میں انسان کو مبتلا کرتا ہے اور سب سے پہلے اسے دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

مسیحا کے روپ میں انسانیت کا قتل کرنے والے ڈاکٹر عامر کی جمال دین سے اس دھندے کے متعلق اقتباس ملاحظہ کیجیے:

'' آپ خود سوچیں اگر ہم یہ مریض تیار کر کے آپ کے پاس نہ بھیجیں تو کیا ہوگا؟۔۔۔ مالدار نوجوانوں کو تلاش کرنا اور پھر انہیں ہیروئن کا عادی بنانا آسان کام نہیں ہے، اگر ہم تعاون ختم کر دیں تو یہ ہسپتال ایک دن میں۔۔۔۔۔''

ان ڈراموں کے علاوہ پہلی بوند، بھولا ہوا راستہ، بادل اور زمین وغیرہ شامل ہیں۔ ان ڈراموں میں ہمیں وہی کردار ملتے ہیں جو ہمارے اردگرد بھی گردش کرتے ہیں۔ ان کے ڈراموں کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں مکالمے آسان ہیں اور ان تمام ڈراموں کے کردار امرا طبقے کے نہیں بلکہ متوسط طبقے کے ہیں۔ اجمل اعجاز کے ڈراموں کے مطالعہ کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ یہ معاشرے کے حالات سے ناواقف نہیں ہیں بلکہ اپنے اردگرد کے افراد کی کیفیات سے آشنا ہیں۔ جنھیں انھوں نے فنکارانہ انداز میں ڈراموں کی شکل دی ہے۔ یہ ڈرامے زندگی آمیز ہیں اور ان ڈراموں میں ان کی فکر کی گہرائی اور مشاہدہ دیکھا جاسکتا ہے۔ جزبات واحساسات کی ترجمانی انہوں نے ڈراموں میں خوب کی ہے۔ ان کے ڈراموں کے کرداروں میں چاہے ایاز کا کردار ہو یا عارف اور سلمان کا یہ مثالی کردار معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے سب ڈراموں میں نسوانی کردار بھی جاندار ہیں۔ بقول ڈاکٹر الیاس:

''اجمل اعجاز اپنے ڈراموں کا مجموعہ لا رہے ہیں، یہ ہمت اور اعلیٰ ادبی احساس کا ثبوت ہے۔۔۔ ڈرامے سے ان کا فطری لگاؤ ہے اور وہ اس کے بنیادی اصول سے بھی واقف ہیں اور یہ ہی بات فی زمانہ کم یاب ہے۔''

☆☆☆☆☆

''قلزم انوار''

قلزم انوار لاریب اسم مسمّٰی ہے کہ ہر لہر میں ایک بحر موجزن ہے۔ حُسنِ الفاظ ندرت معانی عقیدت کی صداقتوں کی نہریں جاری و ساری ہیں۔ حضور پُرنور سے ارادت و عقیدت کے دریا موجزن ہیں۔ جابجا عشق رسالت مآب کی سنہری کشتیاں فردوسِ نظر ہیں۔ ہر طرف کیفیات جمال کے رنگین بجرے رواں دواں ہیں جو عشاقانِ مصطفیٰؐ کے قلوب واذہان کو منور و مستیز کر رہے ہیں۔ ناچیز آپ کو ایسی مبروک مبرور اور مسعود تصنیف پر مبارکباد پیش کرتا ہے۔

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں۔ سچ ہے فخر موجودات سرکارؐ دو عالم کی خصوصیت نظر عنایت کے بغیر ایسا عظیم کارنامہ سرانجام نہیں دیا جاسکتا تھا۔

بے شک:

جس طرف چشم محمدؐ کے اشارے ہو گئے
جتنے ذرے راہ میں آئے ستارے ہو گئے

مجھے یہ معلوم کر کے بھی خوشی ہوئی ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کے زیرِ اہتمام آپ کی اس کتاب مستطاب کی تقریب رونمائی ہو رہی ہے۔ میں موسم حج کی مصروفیات کے سبب حاضر نہ ہوسکوں گا مگر میری دعائیں اور نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

اللہ کریم آپ کو زیادہ سے زیادہ خدمت اسلام کرنے اور سلاطین چشت اہل بہشت کے مشن کی مشعل کو مزید تاباں کرنے کی توفیق کثیرہ عطا فرمائے آمین۔ بجاہ سید المرسلینؐ آپ کے تمام اہل حلقہ ارباب عقیدت کو ناچیز کا سلام پہنچے۔

بآں گرد ہے کہ از ساغرِ وفا مستند
سلام ما برسانید ہر کجا ہستند

☆☆☆☆☆

سید حامد سعید کاظمی

"مجھے تمبر پسند ہے"..... تیرہ افسانوں کی جھلمل

"مجھے تمبر پسند ہے" محمد طارق علی کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ وہ افسانہ نگار، مترجم، مبصر، مضمون نگار، مزاح نگار ہیں۔ زندہ دل، زندہ ضمیر، زندہ ذہن شخصیت ہیں۔ ان کی پُرکشش دل آویز گفتگو میں بلا کی اپنائیت ہے۔

طارق علی نے پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز راول پنڈی میں صحافت سے کیا۔ روزنامہ "تعمیر"، "جنگ"، اور "نیوٹائمز" میں بطور سب ایڈیٹر کام کیا۔ پھر سرکاری ہفتہ وار جریدہ "ہلال" میں فیچر رائٹر رہے۔ بعدازاں صوبائی محکمہ اطلاعات (آرٹیکل رائٹر)، نیشنل اسمبلی (سینئر ٹرانسلیٹر)، وزارت قومی امور اور وزارت تعلیم (اے آر او)، فارن آفس (فسٹ سیکرٹری) میں خدمات انجام دیں۔ آج کل ریٹائرمنٹ کے مزے لوٹ رہے ہیں۔

اس کتاب سے پہلے بقول اُن کے لاہور سے مندرجہ ذیل کتب شائع ہو چکی ہیں۔ جاسوسی ناول ہیں: "ایک لڑکی چار تابوت" اور "تیسرا ایجنٹ" (تراجم)۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ اگر مصنف چاہیں تو اپنی درجن بھر کتابیں مرتب کر کے چھپوا سکتے ہیں مگر اس کام میں، جیسا کہ راقم نے محسوس کیا، وہ ذرا نہیں بلکہ کافی سست واقع ہوئے ہیں، غالباً اپنی کسر نفسی کے سبب۔ اس کتاب میں عذرا اصغر، غازی غلام رضا، احتشام الدین کے اچھے تاثراتی مضامین شامل ہیں۔

زیرِ نظر مجموعے میں کل تیرہ افسانے ہیں۔ طارق علی ایک مشاق افسانہ نگار ہیں۔ وہ فطری انداز میں لکھتے ہیں ان کے مشاہدات غضب کے ہیں۔ منظر کشی اور جزئیات نگاری میں بھی طاق ہیں۔ وہ رومانوی مناظر اور رومانی مکالمے لکھنے پر اچھی دسترس رکھتے ہیں۔ ان کے مکالمے اتنے حقیقی اور پُراثر ہیں کہ قاری کو جکڑ لیتے ہیں۔ البتہ اختتام قدرے مختلف ہوتا ہے۔ ایسا انجام جو ان کی فنی صلاحیت سے میل نہیں کھاتا مگر ایسا ہر افسانے میں نہیں ہے۔

اس کتاب میں مصنف کا نمائندہ بلکہ شاہکار افسانہ "ٹیوشن" ہے۔ اس افسانے میں خود ان کی زندگی بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ تاہم راقم کو پوری کتاب "مجھے تمبر پسند ہے" اسی بات کی آئینہ دار لگتی ہے۔ وہ اپنے افسانے کو حالات و واقعات کے بیان سے ایسی وسعت عطا کر دیتے ہیں جس سے اس کا کینوس تاریخ، سیاست، ادب، معاشرے بلکہ ذات سے آفاق تک وسیع ہو جاتا ہے۔

طارق علی اپنی ملازمت میں نیپال کی راج دھانی، کھٹمنڈو میں کچھ عرصہ مقیم رہے۔ وہاں کے پس منظر میں لکھے افسانے پورے شہر بلکہ پورے ملک کو ہماری آنکھوں کے سامنے لا کھڑا نہیں کرتے بلکہ ہمارے وجود میں ایک ایسی لگن جگا دیتے ہیں کہ ہم پَر لگا کر اُڑیں اور وہاں پہنچ جائیں۔ ان کے مقامی رنگ کے افسانوں میں بھی زندگی نہ صرف پوری طرح سانس نہیں لیتی ہے بلکہ چلتی پھرتی، ٹھہرتی اور بھاگتی نظر آتی ہے۔ نہ تھکتی ہے اور نہ ہی ناامید ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

زاہد رشید

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے تلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

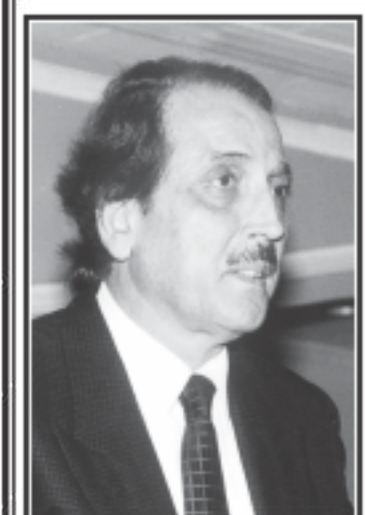

شوکت علی شاہ

لعل سوہانرا پارک بہاولپور کی شناخت ہے۔ ۱۹۶۶ء میں ایک غیر ملکی ماہرین کی ٹیم نے وائلڈ لائف کے متعلق جو رپورٹ حکومت پاکستان کو دی اس میں نہ صرف اُن وجوہ کی نشاندہی کی گئی تھی جن کی وجہ سے جنگلی حیات متاثر ہو رہی تھی بلکہ ان علاقوں کی بھی نشاندہی کی جہاں نیشنل پارک قائم ہو سکتے تھے۔ حکومت نے رپورٹ کی روشنی میں تین نیشنل پارکوں کی منظوری دی۔ سب سے پہلا پارک یہی لعل سوہانرا تھا۔ مقصد کالی نسل کے ہرن، چنکارا ہرن، نیل گائے اور معد کی نسل کو تحفظ دے کر پروان چڑھانا تھا۔ دوسرا

نیشنل پارک نیزا کے قریب خنجراب کے مقام پر تجویز کیا گیا۔ مقصد برفانی چیتے، مارکو پولو سنگ کی بھیڑوں اور پہاڑی بکروں Ibex کی نسلوں کو Natural Habitat میسر کرنا تھا۔ تیسرا سندھ میں حیدر آباد کے مقام پر بنایا گیا۔ پارک کا نام ایک بزرگ دین لعل سوہانرا کے اسم مبارک پر رکھا گیا۔ حکومت پنجاب نے ابتدائی طور پر ۱۷۷۴۸۰ ایکڑ اراضی پارک کے نام مختص کردی۔ آہستہ آہستہ اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس وقت ڈیڑھ لاکھ ایکڑ اراضی میں سے صرف بائیس ہزار اراضی سیراب ہوتی ہے۔ اس کو پانی ڈیزرٹ کنال سے ملتا ہے۔

پنجاب کے حکمرانوں میں سے سب سے پہلے گورنر جنرل جیلانی نے اس پر توجہ دی۔ اُنہوں نے پارک کا دورہ کیا۔ بہاولپور سے پارک تک ۳۲ کلومیٹر چوڑی سڑک بنوائی اور ایک چڑیا گھر قائم کیا۔ میاں نواز شریف نے بھی اس کی ڈیولپمنٹ پر خصوصی توجہ دی۔ پارک کے اندر نہایت خوبصورت ریسٹ ہاؤس اور جھیل بنوائی۔ Loin سفاری کے لئے چڑیا گھر سے کچھ شیر بھجوائے اور ریسٹ ہاؤس سے ملحق ہیلی پیڈ بنوایا۔ جن لوگوں نے افریقن سفاریاں دیکھی ہیں شاید وہ مایوس ہوں کیونکہ گنتی کے چند شیر اکثر بیمار رہتے ہیں۔ انہوں نے شکار کیا کرنا ہے، اپنے زخم چاٹنے سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ بلیک بکس، چنکارا ہرن اور نیل گائے البتہ خوب پھل پھول رہے ہیں۔ انہیں صحرا اور جنگل کا ماحول راس آ گیا ہے۔ ہرن بظاہر تو بہت بھولا اور ڈرپوک جانور ہے لیکن زہرتوں کی مادہ کے حصول کے لئے لڑائی دیکھ کر یوں گمان ہوتا ہے کہ ڈر خوف اُن کے قریب سے بھی نہیں گزرا اور وہ مرے مارے بغیر دم نہیں لیں گے۔

وزیراعظم کا ہیلی کاپٹر اُترا تو ہم نے ان کا استقبال کیا۔ کمشنر چوہدری ریاض اور ڈی آئی جی ملک اشرف سے ہاتھ ملا کر جب میرے پاس پہنچے تو مجھے دیکھ کر کسی قسم کی حیرانی کا اظہار نہ کیا۔ صرف اتنا پوچھا "شاہ صاحب! آپ کب سے ادھر ہیں؟" اس ایک جملے نے ہر چیز عیاں کردی۔ یہ وہ نواز شریف نہیں تھا جس نے آٹھ سال قبل مجھے کمشنر بہاولپور بننے کی نوید دی تھی اور جو مجھے چیف سیکرٹری پنجاب دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے انہیں کہنے کے لئے بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ اسی لمحے یہ سوچ غالب آ گئی کہ کچھ بھی کہنا سعی لاحاصل ہوگا۔ یہ وہ پنجاب کا پرانا وزیراعلیٰ نہیں ہے، بلکہ بھاری مینڈیٹ والا وزیراعظم پاکستان ہے۔

رات انہوں نے پارک کے ریسٹ ہاؤس میں گزاری۔ ڈنر کا انتظام فاروق انور عباسی نے کیا تھا۔ اس رات انہوں نے شکار بھی کیا۔ ڈی آئی جی نے دو گاردیں بھجوانا

چاہیں تو انہوں نے انکار کر دیا بولے "اس کی ضرورت نہیں ہے"

"ہے! سر!" ملک اشرف نے وضاحت کی۔ "یہ علاقہ ڈاکوؤں کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ خدانخواستہ آپ کی ان سے مڈھ بھیڑ ہو سکتی ہے۔ ہم ملازمت پیشہ لوگ ہیں کتاب کے مطابق چلتے ہیں۔"

میاں صاحب مسکرائے "لیکن ہم سے فاصلہ رکھیں۔ ان کی وجہ سے شکار کا مزہ جاتا رہتا ہے۔"

میاں صاحب کی شکاری پارٹی میں ان کے دوست احباب تھے۔ ایک شخص کو دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ یہ ان کا پرائیویٹ سیکرٹری قمر تھا۔ بڑھاپے اور سردی کی وجہ سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ یہ کسی زمانے میں بریگیڈیئر صاحب داد خان کا پی اے تھا۔ پتہ نہیں نواز شریف تک کیسے پہنچا۔ کلرک سے ایل ڈی اے کا ڈائریکٹر جنرل بنا دیا گیا۔ اس کی گردن میں سریا آ گیا تھا۔ بات سننے میں بھی یوں تاثر دیتا جیسے اس پر ناروا بوجھ ڈال دیا گیا ہے۔ جب میں سیکرٹری پی ٹی اے تھا تو ایک دن میرے پاس آیا۔ کہنے لگا "خاندان میں شادی ہے۔ مجھے دو بسیں فری چاہئیں۔ میرے پاس پٹرول کے پیسے بھی نہیں ہیں خصوصی شفقت فرمائیں۔"

اس نے بندوق ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی اور کارتوس کی پیٹی گلے میں پھولوں کے ہار کی طرح ڈالی ہوئی تھی۔ بالکل جم کاربٹ کی نسل کا کوئی فرد معلوم ہوتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ بندوق چلانا تو درکنار فائر کی آواز سن کر ہی اس کی سانسیں اُکھڑ جائیں گی۔

کھلی کچہری: مغلوں کے زمانے میں مینا بازار لگتے تھے لیکن عدل جہانگیری بھی مشہور تھا۔ بادشاہ کھلے عام لوگوں میں بیٹھ کر شکایات تو نہیں سنتا تھا لیکن اس نے محل میں ایک گھنٹی ضرور لٹکا رکھی تھی۔ فریادی نیچے سے رسی ہلاتے تو ظل سبحانی کو پتہ چل جاتا کہ کہیں انیائے (ناانصافی) ہوا ہے۔ چنانچہ انصاف فوراً حرکت میں آ جاتا اور ملزم کو کڑی سے کڑی سزا ملتی۔ عدل تو اس نے ملکہ نور جہاں کے پہلے خاوند شیر افگن کے ساتھ بھی کیا تھا لیکن اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ہمارے مورخین کا قلم بدکتا ہے کیونکہ اس طرح اسلام کو خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ دھوبی کے قتل پر نور جہاں کو سزا دینے والے ڈرامہ کا ذکر بھی چسکے لے کر بیان کیا جاتا ہے۔ انصاف پسند اس قدر کہ اس عزیز از جاں ملکہ کے لئے سزائے موت تجویز کر دی اور دوسری طرف محبت اس قدر کہ ناراض ملکہ کو مناتے ہوئے بولا "تو اگر کشتہ شدی آ چہ می کردم من"

عجیب متلون مزاج شہزادہ تھا۔ کبھی تو کسی کنیز کے عشق میں آہیں بھرتا تو کبھی کسی رقاصہ کو دل دے بیٹھتا۔ پھر شادی بھی کی

تو ایک بیوہ سے جو خوبصورت تو یقیناً ہوگی لیکن چند بچوں کی ماں بھی تھی۔ بھٹو صاحب نے عدل جہانگیری کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے انصاف کو عوام کی دہلیز تک پہنچانے کا فیصلہ کیا۔ پہلے تو خود بند کمرے میں بیٹھ کر کھلی کچہریاں لگائیں پھر ڈپٹی کمشنروں اور پولیس کپتانوں کو اپنے دفتر سے باہر بیٹھ کر عوامی شکایات سننے کا حکم صادر فرمایا اور رفتہ رفتہ اُسے کھلی کچہریوں میں بدل دیا۔ مقصد یہ تھا کہ ہزار آدمیوں کے ضلع کچہری آنے کی بجائے بہتر ہے کہ چند افسران اُن کے گھر جا کر عوامی شکایات سنیں اور موقع پر فیصلے کریں۔ اسے ایک اعتبار سے ون ونڈو آپریشن بھی کہا جا سکتا تھا۔ ضلعی سربراہ کے لئے لازم تھا کہ کھلی کچہری سے خطاب کرتے ہوئے وزیراعظم کی عظمت کے گن گائے، جن کے ذہن رسا نے سلگتے ہوئے عوامی مسائل کے حل کا نادر طریقہ سوچا تھا۔

بھٹو صاحب نے امیج بلڈنگ کی جو روایت ڈالی تھی اسے کوئی حکمران بھی نظر انداز نہ کر سکا اور عنان حکومت سنبھالتے ہی پہلا حکم کھلی کچہریوں کے انعقاد کا جاری کرتا۔ کھلی کچہریاں ڈپٹی کمشنر اور اے سی کی سطح پر منعقد ہوتیں۔ میں نے چارج سنبھالتے ہی پہلی کھلی کچہری احمد پور ایسٹ میں لگائی۔ کیونکہ یہ ضلع کا بہت اہم شہر تھا۔ کسی زمانے میں ریاست کا ہیڈ کوارٹر بھی رہا۔ ڈیرہ نواب اور صادق گڑھ پیلس اس کے قرب و جوار میں تھے۔ بہاولپور ۱۷۱۸ء میں آباد ہوا۔ یہ تاریخی شہر گیارہ سال بعد اپنے ہم نام کے ساتھ معرضِ وجود میں آیا۔ یہ احمد خان پرجانی نے آباد کیا۔ دوسرے کی بنیاد شہباز خان نے ۱۷۵۹ء میں رکھی۔ ناموں میں فرق ظاہر کرنے کے لئے پرجانی والا قصبہ احمد پور شرق کہلایا اور دوسرے کو احمد پور لمہ کہا گیا۔ ۱۷۵۸ء میں دریائے گھارا میں سیلاب آیا تو مکمل طور پر تباہ ہو گیا لیکن جلد ہی اسی جگہ اسی نام سے یہ شہر پھر آباد ہو گیا۔ عبدالقیوم وہاں اے سی تھا یہ یونیورسٹی میں مجھ سے ایک سال جونیئر تھا اور میری ایگزیکٹو کمیٹی کا ممبر تھا۔ تھوڑا سا کھسکا ہوا تھا لیکن چنگ تھا۔ انتظامی امور کو خوش اسلوبی سے نبٹاتا۔ اس نے میونسپل لان میں شامیانے اور قناطیں اور کرسیاں لگوا کر سارے پنڈال کو خوبصورتی سے سجایا۔ پورچ سے لے کر سٹیج تک سرخ قالین بچھوایا۔ اس نے تو پولیس بینڈ کا بندوبست بھی کر رکھا تھا۔ مجھے پتہ چلا تو آخری وقت پر اسے واپس بھجوا دیا۔

جب ہم پنڈال میں پہنچے تو وہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ''فریادیوں'' کے علاوہ سارے معززین شہر کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ پریس کے لئے نہ صرف الگ انکلوژر تھا بلکہ ہوشیار اے سی نے چائے پانی کا بھی بندوبست کر رکھا تھا۔ جو صحافی بھائی بہاولپور سے آئے تھے انہیں ٹرانسپورٹ بھی مہیا کی گئی۔ ہماری

آمد سے قبل ''ہیوی ٹی'' کا ایک دور چل بھی چکا تھا۔ گویا کھلی کچہری شروع ہونے سے پہلے ہی دُور اندیش اے سی نے اس کی کامیابی کی گارنٹی لے لی تھی۔ تمام ضلعی سربراہان بھی وقت پر پہنچ گئے تھے۔ عوامی شکایات سننے سے پہلے میں نے مختصر خطاب کیا ''میاں شہباز شریف'' کی شان میں قصیدہ تو نہ پڑھا لیکن ان کے کارہائے نمایاں کا بطور خاص ذکر کیا جو وہ اپنی انتھک محنت سے سرانجام دے رہے تھے۔ اس میں بیوروکریسی کی اکھاڑ پچھاڑ سرفہرست تھی۔ یہ سن کر سب سرکاری افسروں کے کان کھڑے ہوئے۔ چند ایک پر تو باقاعدہ کپکپی طاری ہوگئی۔ مقصد بھی یہی تھا کہ وہ اپنے فرائض کے ضمن میں تساہل نہ برتیں۔ کھلی کچہریوں کے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ حاضرین کو بتایا کہ بغیر کسی خوف کے کھل کر بات کریں صرف وہ امور زیر بحث نہیں لائے جائیں گے جو عدالتوں میں تصفیہ طلب ہیں۔ آخر میں ان سے اپیل کی کہ سرکاری ملازم عوام کے خادم ضرور ہیں، مجرم نہیں لہٰذا شکایت لگاتے ہوئے جذبات پر قابو رکھیں اور زبان کا استعمال بھی شائستہ ہونا چاہیے۔

میں نے تقریر ختم کی تو شکایات کا انبار لگ گیا۔ جب کوئی شخص دفتر میں درخواست دینے آتا ہے تو سرکاری ماحول کی وجہ سے دبا دبا رہتا ہے، کھل کر بات نہیں کر پاتا۔ کچہریوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ لوگ کھل کر بات کرتے ہیں ویسے بھی فرد کی نفسیات اور ہجوم کی نفسیات میں فرق ہوتا ہے۔ زیادہ تر شکایتیں پولیس، محکمہ مال اور انہار کے خلاف تھیں۔ پولیس پرچہ درج نہیں کرتی۔ تھانے جائیں تو مدعی اور ملزم کو ایک چھڑی سے ہانکا جاتا ہے اور دونوں سے نذرانہ وصول کیا جاتا ہے۔ تھانیدار اچھے موڈ میں ہو تو اوئے کہہ کر بلاتا ہے وگرنہ گالیوں کی پٹاری کھول دیتا ہے۔ وہ لوگ زیادہ شاکی تھے جن کی بچیاں اغوا ہوگئی تھیں۔ ایک بوڑھا شخص رو رو کر بتانے لگا اس کی بیٹی اغوا ہوگئی ہے۔ تھانے رپٹ درج کرانے گیا تو محرر عجب سوال پوچھنے لگا۔ شکل و صورت کیسی ہے۔ رنگ گورا ہے یا سانولا۔ پہلے بھی کبھی کسی کے ساتھ بھاگی ہے یا خاندان کے منہ پر پہلی مرتبہ کالک لگائی ہے، صحت مند ہے یا بس تمہاری طرح مریل سی ہے۔ بدبخت باندھ کر رکھتے، بھیڑ بکریوں کی طرح کھلا کیوں چھوڑ رکھا تھا۔

محکمہ مال کا محور و مرکز ہمیشہ پٹواری رہا ہے۔ دیہاتیوں نے شکایتوں کا طومار باندھ دیا۔ فرد نہیں دیتا مالیہ وصول کر کے رسید نہیں کاٹتا، رشوت کا ریٹ بڑھا دیا ہے، پہلے سو روپے میں نقل مل جاتی ہے اب پانچ سو مانگتا ہے۔ کہتا ہے اُوپر بھی تو پہنچانی ہے۔ اگر چند دن تاخیر ہو جائے تو افسران بالا کسی نہ کسی بہانے معطل کر دیتے ہیں، تبادلے کی

تلوار الگ سے لٹکی رہتی ہے۔ کچھ لوگوں کو شکایت تھی کہ ان کی زمین پٹواری کی ملی بھگت سے مخالفین کے کھاتے میں چلی گئی ہے۔ یہ پٹواری کم اور پراپرٹی ڈیلر زیادہ ہے۔ ہر وقت ممبر اسمبلی کی گود میں بیٹھا رہتا ہے۔ ہے تو یہ پٹواری لیکن اس نے دو ریٹائرڈ پٹواری ملازم رکھے ہوئے ہیں اُن سے قانونی داؤ پیچ اور ہیرا پھیریاں سیکھتا رہتا ہے۔ اری گیشن ڈیپارٹمنٹ کے متعلق عمومی شکایت یہ تھی کہ جتنا پانی چوری ہوتا ہے وہ سب ان کی ملی بھگت سے ہوتا ہے۔ بڑے زمیندار موگے کاٹ کر غریب کاشتکاروں کے حصے کا پانی لے جاتے ہیں۔ شکایت پر بھی ان کا چالان نہیں ہوتا۔ وارہ بندی کے لئے بھی ان کی مٹھی گرم کرنا پڑتی ہے۔ سب سے زیادہ شکایت ان لوگوں کو تھی جن کی زمینیں Tail پر تھیں۔ ایک کسان کہنے لگا ''صاحب! ہم دوہرے عذاب میں مبتلا ہیں۔ جب فصلوں کو پانی دینا ہوتا ہے تو وہ دستیاب نہیں ہوتا اور برسات کے موسم میں ضرورت نہیں ہوتی تو سارا پانی ٹیل پر بھیج دیتے ہیں جس سے پودے ڈوب جاتے ہیں اور فصل کو شدید نقصان پہنچتا ہے۔

ہوسکتا ہے بھٹو صاحب کا مطمع نظر سیاسی ہو لیکن کھلی کچہریوں کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ موقع پر پہنچ کر بھری محفل میں بیٹھ کر نہ صرف لوگوں کے مسائل اور مصائب کا ادراک ہوتا ہے بلکہ انہیں موثر طریقے سے حل بھی کیا جاسکتا ہے۔ ظلم اور زیادتی اگر جڑ سے نہ بھی اکھڑ سکیں تو صریحاً ناانصافی کو یقیناً ختم کیا جاسکتا ہے۔ ہم نے موقعہ پر ہی بے شمار مقدمات کا فیصلہ کیا۔ مظلوم کو اس کا حق دلوایا۔ جہاں ممکن تھا فریقین میں صلح کروادی۔ کئی جھگڑے محض ضد اور انانیت کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ لوگوں کی انگیخت پر تماش بینوں کے اُکسانے پر لاٹھیاں نکل آتی ہیں۔ جہاں مزید تحقیق کی ضرورت تھی وہاں اے سی اور ڈی ایس پی کو ہدایت کی کہ انکوائری کر کے سچ اور جھوٹ کا تعین کریں۔ مظلوم کی دادرسی ہو اور ظالم کے خلاف قانونی کارروائی کر کے سات دن میں رپورٹ کریں۔ محکمہ نہر والوں کو متنبہ کیا کہ پانی کی چوری کی صورت میں نہ صرف پانی چور بلکہ محکمے کے متعلقہ اہلکار کے خلاف بھی پرچہ درج کیا جائے گا۔ تعزیرات پاکستان میں اعانت مجرمانہ کی شق اسی لئے رکھی گئی ہے۔

کھلی کچہریوں میں چند بلیک میلر قسم کے لوگ بھی آ جاتے ہیں۔ یہ پیدائشی شکایتی ہوتے ہیں۔ محکموں کے افراد کو ڈرا دھمکا کر اپنا اُلو سیدھا کرتے ہیں۔ دراصل کوئی اہلکار بھی نہیں چاہتا کہ شکایت کی صورت میں وہ ملزموں کی طرح بھری محفل میں کھڑا ہو کے اپنی صفائی پیش کرے۔ بلیک میلروں کی چاندی تو ہوتی ہی ہے لیکن ضرورت مندوں

کے بھی کافی جائز کام ہو جاتے ہیں۔ محکمے کے سربراہ کو کافی حد تک اندازہ ہوتا ہے کہ کس کس نے شکایت کرنی ہے لہٰذا وہ اسے بلا کر پہلے ہی مسئلے کا حل نکال لیتے ہیں۔

کھلی کچہریوں میں اکثر پولیس اور محکمہ مال والے اپنے حواریوں کا گروہ بھی لے آتے ہیں۔ جیسے ہی کوئی شخص کسی اہلکار پر ذاتی نوعیت کا الزام لگاتا ہے تو وہ گروپ کھڑا ہو کر اس کے خلاف بولنا شروع کر دیتا ہے۔ اس شور و غوغا اور غل غپاڑے میں اہلکار سے توجہ ہٹ جاتی ہے۔ یہ تکنیک صرف خرانٹ، تجربہ کار اور پیشہ ور اہلکار ہی استعمال کر سکتے ہیں ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔

تین بجے تک شکایات کا سلسلہ چلتا رہا۔ آخری شکایت نبٹا کر جب ہم پنجند کے ریسٹ ہاؤس میں پہنچے تو چار بج رہے تھے۔ قیوم نے وہاں لنچ کا بندوبست کیا تھا۔ پنجند ریسٹ ہاؤس کا شمار محکمہ انہار کے خوبصورت ریسٹ ہاؤسوں میں ہوتا ہے۔ پنجند وہ مقام ہے جہاں پنجاب کے تین دریا راوی، جہلم اور چناب یکجا ہوتے ہیں۔ کہنے کو تو ستلج بھی ان میں شامل ہے لیکن اس کا پانی صرف برسات کے موسم میں مہیا ہوتا ہے۔ سندھ طاس معاہدے کی رو سے یہ دریا ہندوستان کے حصے میں آیا ہے۔ لالہ چڑی تو دے سکتا ہے دمڑی نہیں دیتا۔ پانی کہاں سے دان کرے گا۔ انہوں نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ ایک بوند پانی بھی بوقت ضرورت دستیاب نہیں ہوتی اور جب ضرورت نہیں ہوتی تو سارا ملبہ پاکستان پر ڈال دیتا ہے۔ ۱۹۸۶ء کے سیلاب میں بہاولپور شہر کا ایک حصہ ڈوب گیا تھا۔ ستلج نے ترنگ میں آ کر انگڑائی لی تھی۔ دریا میں کبھی کبھی پانی کی جو بوند نظر آتی ہے وہ دریائے چناب کی مرہونِ منت ہے۔ نہر نکال کر اس میں پانی ڈالا گیا ہے تا کہ اس کے کنارے پر زمینیں سیراب ہو سکیں۔

ریسٹ ہاؤس کے باورچی ویسے تو بہت ٹرینڈ ہیں لیکن مچھلی پکانے میں انہوں نے خصوصی مہارت حاصل کر رکھی ہے کیونکہ جو کوئی بھی آتا ہے وہ تازہ مچھلی کی فرمائش کرتا ہے۔ ہیڈ ورکس پر مچھلیاں پکڑنے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ پنجند سے کئی نہریں نکلتی ہیں جو ضلع بہاولپور، رحیم یار خان اور مظفر گڑھ کی زمینوں کو سیراب کرتی ہیں۔ ریسٹ ہاؤس ہے تو بہاولپور میں لیکن ملکیت مظفر گڑھ کی شمار ہوتا ہے۔ جونہی ہیڈ ورکس کراس کریں مظفر گڑھ کی حدود شروع ہو جاتی ہیں۔ سڑک کے دورویہ انار کے باغات ہیں۔ آتش چناروں کی ہو یا اناروں کی بہت بھلی لگتی ہے۔

ایک دن رات کو مشترکہ گشت کے لئے چوہدری عبدالمجید آئے تو خاصے پریشان تھے۔ بار بار ماتھے سے پسینہ پونچھتے۔ میں نے چائے منگوائی اور خیریت دریافت کی۔ بولے "وہی تو نہیں ہے۔ اس ڈی آئی جی نے مجھے زچ کر دیا ہے۔ پتہ نہیں اس کا کیا مسئلہ ہے، ہر وقت جھاڑتا رہتا ہے۔ ہر روز کسی

نہ کسی بہانے Stinker بھیج دیتا ہے۔ میں نے ڈیوٹی میں کبھی غفلت نہیں برتی، رزق حلال کھاتا ہوں۔ ابھی جب میں گھر سے نکل رہا تھا تو اس کا ہرکارہ یہ خط دے گیا ہے۔" انہوں نے جیب سے وہ خط نکال کر دکھایا۔ کسی مفروضہ کوتاہی پر ان کی جواب طلبی کی گئی تھی۔ اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے "میں نے اپنی ٹرانسفر کروالی ہے۔ کل تک نوٹیفکیشن جاری ہو جائے گا، سپیشل برانچ میں تعینات کیا جا رہا ہے۔ آپ کے کہنے پر آ گیا ہوں حالانکہ اب یہ میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی۔"

مجھے افسوس ہوا۔ ایک اچھا افسر ضلع چھوڑ کر جا رہا تھا۔ ملک اشرف ایک پیشہ ور افسر تھے۔ ان کا تعلق تحصیل خوشاب سے تھا۔ ایماندار تھے، فرائض منصبی بھی ٹھیک طرح ادا کرتے، ان کے افسران بالا بھی اُن سے خوش تھے لیکن بدقسمتی سے ماتحتوں کے ساتھ ان کا سلوک مخاصمانہ تھا اور ہمیشہ سخت رویہ اختیار کرتے۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری برہنہ گفتاری تھی۔ ماتحتوں کو کچی نگی گالیاں دیتے اور معمول کوتاہی پر بھی معطل کر دیتے۔

ملک مجید چلا گیا تو اس کی جگہ احمد مبارک آیا۔ وہ بھی ایک پروفیشنل افسر تھا۔ سخت گیر تھا لیکن ملک صاحب کی سی گالیوں کی Vocabulary نہ رکھتا تھا۔ وہ آتے ہی بیمار پڑ گیا۔ کچھ عجیب نوعیت کی بیماری تھی۔ ہسپتال میں داخل ہوا اور سوکھ کر کانٹا بن گیا۔ نقاہت کی وجہ سے بستر سے اُٹھ بھی نہ سکتا تھا۔ میں ہسپتال عیادت کے لئے گیا تو کہنے لگا "بیماری نے طوالت اختیار کر لی ہے، کل کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے والدین میرے پاس رہیں ہو سکے تو کار کا بندوبست کر دیں جو انہیں لاہور سے لے آئے۔ میں اپنے ماتحت عملے کو نہیں کہنا چاہتا۔ کل کلاں سب کو کہتے پھریں گے بڑا ایماندار افسر بنتا تھا آخر گاڑی تو ہم نے ہی لے کر دی ہے۔"

میں نے فیاض تحسین کو فون کر کے گاڑی کا کہا۔ جب باہر نکلا تو ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر خاصا مایوس لگتا تھا۔ کہنے لگا "کوئی معجزہ ہو تو جبھی بچ سکتا ہے۔ میں تو قریباً ناامید ہو چلا ہوں" بہرحال علاج جاری ہے۔ میں ایم ایس کو ملا اور اسے ہدایت کی کہ لاہور یا ملتان سے کوئی قابل ڈاکٹر منگوا کر از سر نو تشخیص کی جائے۔ اس کی ابھی عمر ہی کیا ہے۔ ویسے بھی میں ایک اچھے افسر سے محروم نہیں ہونا چاہتا۔

میں صبح شام اس کی عیادت کے لئے جاتا۔ وہ چند ماہ ہسپتال میں رہا۔ ایک دن اسی ڈاکٹر نے اچھی خبر سنائی۔ وہ آہستہ آہستہ تندرست ہو رہا تھا۔

نیپا میں چند ماہ —— لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو: بہاولپور میں

ایک سال رہا، خاصا مصروف وقت گزرا۔ ممبران اسمبلی کی متلون مزاجی کو شروع سے ہی سمجھ لیا تھا۔ کون کتنے پانی میں ہے کس قسم کا برتاؤ چاہتا ہے، اُسے ہینڈل کرنے کا کیا طریقہ ہے۔ کسی بھی کامیاب ایڈمنسٹریٹر کے لئے ضروری ہے کہ وہ توازن قائم کرے اور انہیں یکجا نہ ہونے دے۔ گو Divide & rule کا لفظ خاصا بدنام ہو چکا ہے لیکن یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ منقسم کیے جانے والے لوگ کس قماش کے ہیں۔ شہباز شریف پوسٹنگ کے معاملے میں کسی ممبر کی سفارش نہیں مانتا تھا، اس کے کہنے پر افسر کو تبدیل بھی نہ کرتا۔ اگر سب یک زبان ہو کر شکایت کرتے تو متعلقہ افسر کو بلا کر کہتا ''میں تمہیں نااہلی کی وجہ سے نہیں بلکہ Tactless ہونے کی بنا پر بدل رہا ہوں۔ ضلع میں کوئی ایک ممبر تو تمہاری طرفداری کرتا۔ ہم سیاسی لوگ ہیں، اس حقیقت کو یکسر نظر انداز نہیں کر سکتے۔

نیپا ٹریننگ ضروری تھی۔ گریڈ ۱۹ سے بیس میں جانے کے لئے ۱۶ ہفتے کا کورس کرنا لازمی تھا۔ بیس سے اکیس کے لئے سٹاف کالج میں ٹریننگ ہوتی۔ نیشنل اسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن اور اسٹاف کالج مال روڈ پر ساتھ ساتھ کھڑے ہیں۔ نیپا کی اپنی عمارت ہے۔ سٹاف کالج کسی زمانے میں پنجاب کلب کی ملکیت تھا۔ کلب انتظامیہ چند جرنیلوں کو ممبر نہ بنانے کی غلطی کر بیٹھی۔ ایوب خان کا مارشل لا لگا تو راتوں رات فوجی ٹرک آئے اور کلب کا ساز و سامان اُٹھا کر سڑک پر پھینک دیا۔ نیپا کا ماحول دیکھ کر زمانہ طالب علمی یاد آ گیا۔ صبح وقت پر کلاس روم میں پہنچنا، کلاسیں شروع ہونے سے پہلے باری باری تلاوت کرنا پڑتی۔ آٹھ بجے سے لے کر شام چار بجے تک کلاسیں اٹینڈ کرنا پڑتیں۔ درمیان میں ایک گھنٹے کے لئے کھانے کا وقفہ ہوتا۔ نیپا کا میس کچھ اتنا اچھا تو نہ تھا لیکن غنیمت تھا۔ خوش قسمتی سے ڈائریکٹر جنرل تنویر ہی صاحب تھے۔ ان کے والد شیخ بشیر احمد کسی زمانے میں افسر مال ہوا کرتے تھے۔ تحصیلداروں کے لڑکے عام طور پر اتنے لائق نہیں ہوتے لیکن شیخ صاحب نے اس پر خصوصی توجہ دی تھی۔ ہی لاابالی پن کے باوصف بہت ذہین طالب علم تھا۔ یونیورسٹی کے ایام میں ہی سب کو علم تھا کہ وہ سول سروس میں ضرور آئے گا۔ نیو ہاسٹل میں ہمارے کمرے ساتھ ساتھ تھے۔ سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ پڑھتا کب ہے۔ رات کو ہم تاش کھیلتے، صبح وہ کلاس روم میں جانے کی بجائے معاملات قلب و نظر پر زیادہ زور دیتا۔ ایک اچھی خاصی لڑکی نے اس کے عشق میں مبتلا ہو کر خاوند سے طلاق لے لی تھی۔ وہ ایئر فورس میں پائلٹ تھا۔

[جاری ہے۔]

غزل

پردہ داری سی پردہ داری ہے
کار انداز ، دستِ باری ہے

حسن کی سرمدی بلندی سے
آبشارِ سکوت جاری ہے

ایسی شفّاف کب جدائی تھی
ہجر نے کینچلی اتاری ہے

وہ مجھے بھی ہلاک کر دے گا
قرب، دریائے تابکاری ہے

سرِ باب دیارِ علم کھلا
آگہی ، حسنِ خاکساری ہے

ٹھوکریں فکر کے پڑاؤ ہیں
عشق دانائی کی سواری ہے

حیرتیں ، عقل کے بکھیڑے ہیں
کارِ دل ، کارِ جاں سپاری ہے

ہچکیاں ، سسکیاں تمام ہوئیں
اور اب سسکیوں کی باری ہے

گلِ کاہِ لحد نہ توڑ کہ یہ
نافۂ آہوئے تتاری ہے

کیسی میٹھی مہک محبت تھی
شعر ، فنِ خطوط کاری ہے

آئنہ ہو گئے اشارے بھی
کاروبارِ کنایہ جاری ہے

نورِ طاق و رواق اے خالد
کس مصوّر کا دستِ باری ہے

جنگ دو گز زمین کی خالد
ہم نے اک عمر لڑ کے ہاری ہے

خالد احمد

غزل

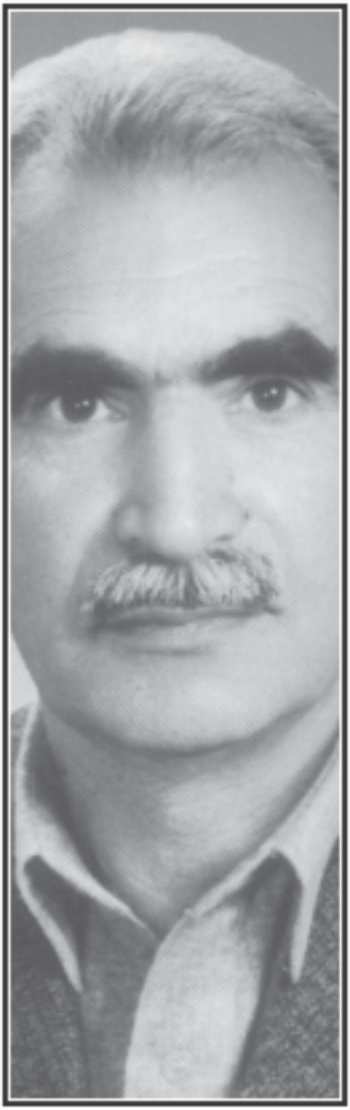

محمد ارشاد

وہ کیا کرے یا کر سکے جب ہو نہ مفر بھی
سینے کے سوا پاس نہیں جس کے سپر بھی

کب آن لگے کیا یہ خبر بے خبروں کو
وہ تیر کہ جس کا ہدف دل بھی جگر بھی

بوسوں سے لبِ خشک ہوں جب تر تو خوشی سے
ملتا ہے گلے ٹوٹ کے پھر بحر سے بر بھی

دل ساتھ نہ دیتا ہو زباں کا تو سخن لغو
اک ساتھ ہوں دونوں تو در آئے ہے اثر بھی

کس دیس سے آئے ہو یہاں جاؤ گے کس دیس
اے خیمہ بدوشاں ہے تمھارا کہیں گھر بھی

کامل نہیں وہ حسن کہ جس میں نہ ہو شامل
صاحب نظراں کا بخدا حسنِ نظر بھی

ہے قحطِ ہنر یا ہیں سبھی اک سے ہنرمند
آتا ہی نہیں رشک کسی کو کسی پر بھی

لگنے لگے ہے جھوٹ بھی سچ، سچ بھی لگے جھوٹ
گاہے گہے بے پر کی کو لگ جاتے ہیں پر بھی

غزل

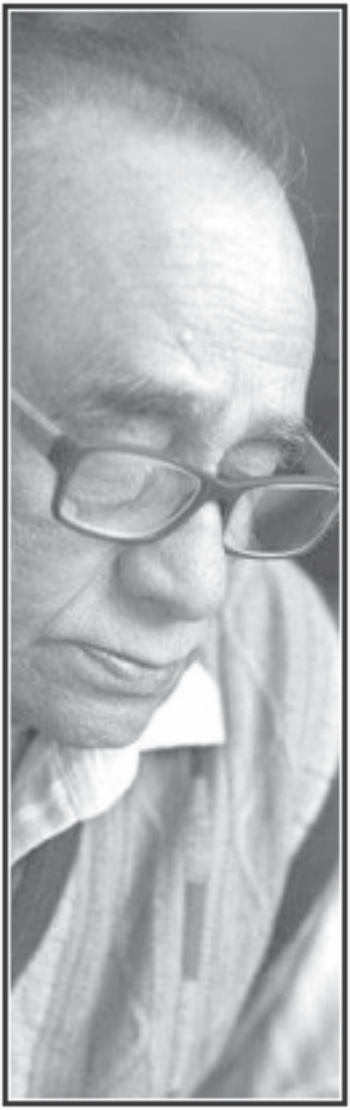

انور شعور

محبت کا نسخہ عجب مل گیا
جو ہم چاہتے تھے وہ سب مل گیا

رفاقت کے موسم کی کیا بات ہے
ہمیں دورِ عیش و طرب مل گیا

نہیں مل سکا تھا جو بَر وقت وہ
خدا کی عنایت سے اب مل گیا

تعیش ہماری ضرورت نہیں
یہ ساماں ہمیں بے سبب مل گیا

زمیں پر نچاکر ہمیں کیا سواد
تجھے گردشِ روز و شب مل گیا

کہاں تھے مرے دل کے مشتاق وہ
یہ تحفہ انھیں بے طلب مل گیا

کوئی خواب تھا یا ملاقات تھی
نہ معلوم وہ ہم سے کب مل گیا

خرافات ہم چھوڑ دیں گے شعور
اگر کوئی جینے کا ڈھب مل گیا

غزل

بے تاب دل میں خواب سہانے کچھ اور ہیں
پیغام جو دیے ہیں ہوا نے کچھ اور ہیں

تکلیف اُس کو ہم سے ہے کچھ اور ہی مگر
غصّہ نکالنے کے بہانے کچھ اور ہیں

سب راز ایک رنگ کے ہوتے نہیں میاں
رکھتے ہیں جی میں اور بتانے کچھ اور ہیں

شب چند ساعتوں کسی موسم کے دھیان میں
ہم نے بسر کیے جو زمانے کچھ اور ہیں

ہر صاحبِ ہنر یہ سمجھتا ہے بس اسے
جو گن عطا کیے ہیں خدا نے کچھ اور ہیں

اُن سے جو اعتراف کرانے تھے اور تھے
اور دل سے جو قصور وہ مانے کچھ اور ہیں

آیا نہیں ہے ختم کو دَورِ محن ابھی
عالی سمے کے جُور اٹھانے کچھ اور ہیں

جلیل عالی

غزل [نذر جان ایلیا]

بات گہری ہے گو ذرا سی ہے
خود شناسی خدا شناسی ہے

اس لئے کھل کھلا کے ہنستا ہوں
میری رگ رگ میں اک اداسی ہے

چند آنسو ہیں میری آنکھوں میں
اور ساری زمین پیاسی ہے

جس طرف لائی ہم چلے آئے
زندگی کیوں خفا خفا سی ہے

سچ تو ہے اپنا تار تار بدن
جھوٹ کا نام خوش لباسی ہے

آج بھی ان سے مل نہیں پائے
بات کہنے کو یہ ذرا سی ہے

ان کا احساں ہے یاد آتے ہیں
دل گنہ گار نا سپاسی ہے

ٹھیک سے دیکھنے نہیں دیتا
یہ جو طوفانِ بدحواسی ہے

حرف کا کیا قصور اس میں کنور
جرم تو حرف نا شناسی ہے

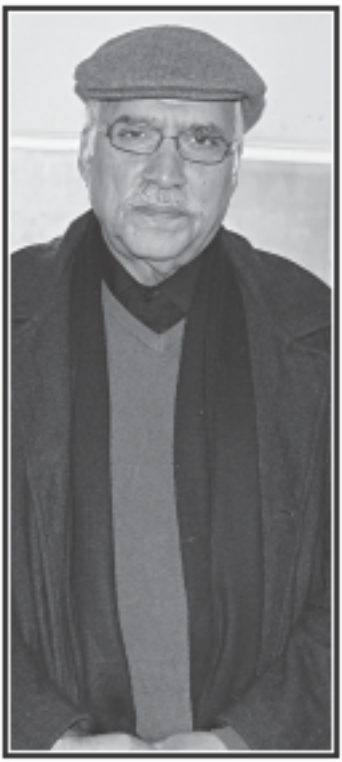

اعجاز کنور راجہ

غزل

ایسا کچھ بھی نہیں کیا میں نے
پھر بھی کیوں زہر پی لیا میں نے

آج بھی سوچتا رہا ہوں بہت
آج بھی کچھ نہیں کیا میں نے

پھر مجھے آندھیوں نے گھیر لیا
بس جلایا تھا اک دیا میں نے

اشک یوں ہی نکل پڑے ہوں گے
یاد اس کو نہیں کیا میں نے

اب ترا نام بھی نہیں لیتا
اپنے ہونٹوں کو یوں سیا میں نے

جام تو میرے پاس بھی تھا مگر
دستِ ساقی سے ہی پیا میں نے

جی تو میں بھی لیا ہوں کہنے کو
لیکن آساں نہیں جیا میں نے

اک پرانا لباس ہے باقی
دھو لیا اور پہن لیا میں نے

باقی احمد پوری

غزلیں

ہوتی تھیں عنایات لگاتار کسی وقت
ہم بھی تھے ترے محرمِ اسرار کسی وقت

رہتے ہیں مرے حجرے میں آلامِ زمانہ
دو چار کسی وقت تو دو چار کسی وقت

جاگ اُٹھتی ہے سوئی ہُوئی آنکھوں کی بھی قسمت
گلیوں میں جب آجاتا ہے بازار کسی وقت

اُمیدِ کرم خستہ مراسم سے نہ رکھیے
گر سکتی ہے ٹوٹی ہُوئی دیوار کسی وقت

شب بھر رہا پلکوں پہ چراغاں کا سماں کیوں
پڑھیے گا ذرا شام کا اخبار کسی وقت

احباب سے ہر لمحہ شکایت نہیں خاورؔ
خاموش بھی رہتے ہیں مرے یار کسی وقت

خاور اعجاز

سورج بھی نکلتا ہو جہاں رات پہن کر
کیا گھومیے اُس شہر کی سوغات پہن کر

تہذیب جسے کہیے وہ عریاں نہیں ہوتی
جنگل میں بھی رہتی ہے مگر پات پہن کر

اکناف میں مشہور ہے خوش پوشی ہماری
دھرتی پہ بھی رہتے ہیں سادات پہن کر

ہر وصل نے اِک ہجر کے خلعت سے نوازا
ہر ہجر کٹا وصل کے لمحات پہن کر

خاورؔ مجھے رشک آتا ہے اُن شوخ دلوں پر
چھتری تلے بیٹھے ہیں جو برسات پہن کر

غزل

لبوں پر التجائیں ہیں زیادہ
دِلوں میں انتہائیں ہیں زیادہ

دِیا روشن کیا جس سمت مَیں نے
اُسی جانب ہوائیں ہیں زیادہ

بہت خاموش ہوں اِس واسطے مَیں
مِرے اندر صدائیں ہیں زیادہ

چلو جنگل میں کر لیں ہم بسیرا
کہ بستی میں بلائیں ہیں زیادہ

بہت شِدّت بھی طوفاں میں ہے اب کے
لبوں پر بھی دُعائیں ہیں زیادہ

زمیں پر جنگ شِدّت سے ہے جاری
فضا میں فاختائیں ہیں زیادہ

نسیمؔ اب بھی ہے گھر میں حبس کتنا!
بظاہر تو ہَوائیں ہیں زیادہ

نسیمِ سحر

غزل

نذر میر

گلزار بخاری

کہیں راحت کہیں بلا لایا
عشق ہر جا ثمر جدا لایا

غم کسی کو ہے چھن گئی دستار
خوش ہے کوئی کہ سر بچا لایا

نعمتیں بے شمار تھیں لیکن
دل وہاں سے دیا اٹھا لایا

کوئی لوٹا نہیں ادھر جا کر
کون اس پار کا پتہ لایا

زندگی! وہ بھی ساتھ چھوڑ گئی
آدمی ہم رکاب کیا لایا

چشمِ مشتاق میں ڈھلے گا وجود
دید کا دن اگر خُدا لایا

ہو گئے گم حواس مستی میں
موسمِ کیف ابتلا لایا

لفظ گلزار کے ہوں جیسے بھی
رنگ اظہار کا نیا لایا

غزلیں

ہاتھ آئی جو پُرکھوں سے وراثت، نہیں چھوڑی
چھوڑا ہے ترا شہر، شرافت نہیں چھوڑی

اس طرح نہ اجڑا تھا کبھی شہر تمنا
اک اینٹ بھی یاروں نے سلامت نہیں چھوڑی

تا عمر رہے ایک ہی کشتی کے مسافر
تا عمر رقیبوں کی حمایت نہیں چھوڑی

وہ شخص اگر بیعتِ ظالم پہ مُصر ہے
کرنی اسے ہم نے بھی ملامت نہیں چھوڑی

قد اپنا گھٹاتا ہی چلا جاتا ہے ناداں
جس شخص نے بونوں کی قیادت نہیں چھوڑی

اُس پنجۂ خونیں کو نکال اپنی صفوں سے
قاتل ہے تو کیوں اس سے شراکت نہیں چھوڑی

کھینچا نہیں ہاتھ اُس نے کبھی جور و جفا سے
پرواز مگر اس سے محبت نہیں چھوڑی

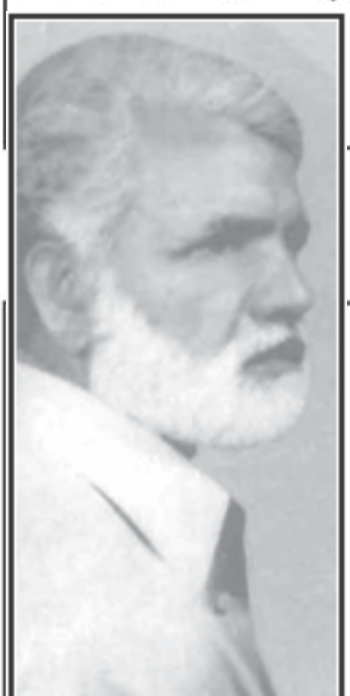

یعقوب پرواز

جب سے ٹھہرے گہرے ساجن تنہائی اور میں
اک دوجے کے دل کی دھڑکن تنہائی اور میں

جھیل رہے ہیں خاموشی سے اپنا اپنا دکھ
تنہا برگد ، سُونا آنگن تنہائی اور میں

جس کی راہیں تکتے تکتے جیون بیت گیا
آج بھی اس کی ضد کا ایندھن تنہائی اور میں

کس کی دھن میں جانے کیا کیا آس لگائے بیٹھے
ایک پپیہا ، بھیگا ساون ، تنہائی اور میں

غزل

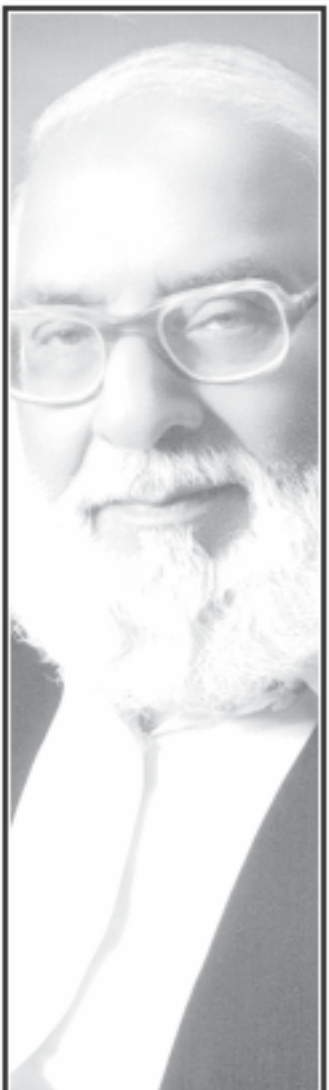

کمال دست ہنر سے اسے سنوارا جائے
بشر کو بحر حوادث میں جب اتارا جائے

اسی سے حسن تخیل میں ضوفشانی ہے
کبھی نہ دور مری آنکھ سے ستارا جائے

میں ناخدا کی بداندیشیوں سے ڈرتا ہوں
نہ وسوسوں میں کہیں ہاتھ سے کنارا جائے

جنوں میں شدت وارفتگی یہی تو ہے
طلب کو آبلہ پا دشت میں پکارا جائے

کبھی تو وادی دل میں بھی روشنی پھوٹے
کوئی تو منظر خوش آنکھ سے گزارا جائے

یہ بے نیازی سود و زیاں غنیمت ہے
کہیں تو اپنے مقدر سے بھی خسارا جائے

یہ برہمی نہ خدوخال میں اتر جائے
الجھتے گیسوؤں کو ٹھیک سے سنوارا جائے

ریاض مزرع ہستی کو پھر ضرورت ہے
جگر کے خون سے پھر سے اسے نکھارا جائے

سید ریاض حسین زیدی

غزل

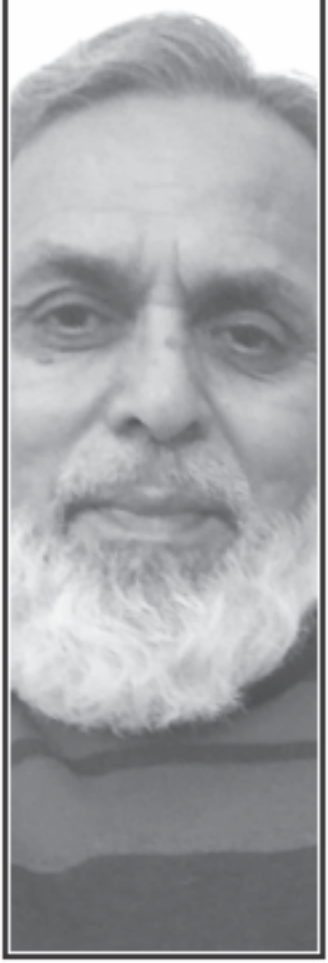

آخری رات یہاں سونا ہے
کل کہیں اور ہمیں ہونا ہے

کوچ کرتے ہیں ، کہ اب اگلا پڑاؤ
اِسی بستی کا کوئی کونا ہے

ایسا لگتا ہے کہ یہ عمرِ رواں
کوئی جادو ہے ، کوئی ٹونا ہے

یاد آئے گی رفاقت تیری
زندگی! تیرے لیے رونا ہے

خوف طاری ہے کہ اب اگلے جنم
جانے کیا پانا ہے ، کیا کھونا ہے

اپنے کاندھے پہ دھرے زادِ سفر
بوجھ ہر ایک نے خود ڈھونا ہے

آخری اشکِ ندامت ، بتلا
میرے غفّار ! کہاں بونا ہے

زندگی! اِتنی تو مہلت دے دے
اپنا ملبوس مجھے دھونا ہے

محمد انیس انصاری

غزل

کس نے کہا یہ تجھ سے، دوبارہ نہیں ہوں مَیں
بجھ سا گیا ہوں، روشنی ہارا نہیں ہوں مَیں

سائے تو گم ہوئے ہیں، مرے احترام میں
وہ جانتے ہیں اُن کا خسارہ نہیں ہوں مَیں

زیبِ فلک تو ہوں، مگر اس کارزار میں
اے خوش نگاہ، صرف نظارہ نہیں ہوں مَیں

گُم رہ نہ جان تو مجھے، گُم کردہ راہ ہوں
بھٹکا ہوا ہوں، راہ اُتارا نہیں ہوں مَیں

خاموشیٔ نگاہ، یہ لب بستگی مری
اس طور اس کو پہلے پکارا نہیں ہوں مَیں

اک شوق سر بہ سر رہے، دریا سا موج زن
دریا بھی وہ کہ جس کا کنارا نہیں ہوں مَیں

خود اپنے بل پہ آیا ہوں میں سطحِ آب پر
موجوں کی سازشوں کا اُبھارا نہیں ہوں مَیں

کھویا ہے وہ کہ حصہ تھا میرے وجود کا
بیٹھا یہ تیرے سامنے، سارا نہیں ہوں مَیں

دیتا ہے حوصلہ یہ، دلِ یارِ بے ریا
کیا پہلے تیرے درد، سہارا نہیں ہوں مَیں!

طارق بٹ

غزل

اگر ہے وہ جو برائے سگاں میسر ہے
تو کہنے دیجیے ہم کو کہاں میسر ہے

ہمیں پتہ ہے کہ ترتیب میں نہیں ہیں ہم
ہمیں وہی ہے کہ جو ناگہاں میسر ہے

مگر وہ تم جو نہ خود ہو نہ تذکرہ ہے کہیں
مگر یہ ہم جنہیں نام و نشاں میسر ہے

ہمیں پتہ ہے کہ نایاب ہے جو ہے وہ ہے
زمانے بھر میں نہیں پر یہاں میسر ہے

زمانہ ہے تجھے از روئے کیف مستقبل
ہمیں تو گزرا ہوا کل کلاں میسر ہے

جو فکرِ فاقہ نہ ہوتی تو مر گئے ہوتے
یہ کم نہیں کہ جو بارِ گراں میسر ہے

تری کریمی کے باعث تری عطا کے طفیل
ہیں خوش نصیب جنہیں رائیگاں میسر ہے

کھلے گی دھوپ تشکر کی انتہا پہ رضا
مگر وہ لوگ جنہیں سائباں میسر ہے

ہم ایسے خانہ پرستوں کی سادگی پہ نہ جا
وہیں ٹھہرتے ہیں جا کر جہاں میسر ہے

ہمیں تو آتی نہیں پھر بھی شعر دیکھیے گا
انہیں تو خیر سے اُردو زباں میسر ہے

فرحت عباس شاہ

غزلیں

ذلت کی بادشاہی سے غربت پسند ہے
مجھ کو یہ سلطنت نہیں عزت پسند ہے

ڈرتا نہیں ہوں جھوٹے خداؤں سے اس لیے
مظلوم آدمی کی حمایت پسند ہے

مے کے علاوہ مجھ سے اگر پوچھتے ہو تو
خاصانِ شہرِ خوباں کی خدمت پسند ہے

مجبوریاں دکھاتی ہیں پتھریلے راستے
ہر شخص کو وگرنہ سہولت پسند ہے

سن کر خوشی ہوئی ہے کہ میری طرح سے تو
دل کے معاملات میں شدت پسند ہے

راحت سرحدی

غبارِ اشک و دلِ لخت لخت باندھے ہوئے
میں انتظار میں بیٹھا ہوں رخت باندھے ہوئے

ذرا سی آنکھ لگی تھی کہ لے اڑا کوئی
سرہانے رکھے تھے گٹھڑی میں بخت باندھے ہوئے

ٹرالیوں پہ لدے اپنے خاندان سمیت
لہولہان پڑے تھے درخت باندھے ہوئے

اچھا تو ہے روایتی طرزِ سخن ترا
لیکن مجھے کلام میں جدت پسند ہے

ہم جیسے سر پھرے نہیں ملنے تمھیں جنہیں
کوئی لقب نہ نام نہ شہرت پسند ہے

راحت یقین آیا ہے آنکھوں سے دیکھ کر
دنیا تو انتہا کی اذیت پسند ہے

نکل ہی آتا ہے کوئی فرار کا رستہ
اسیر جتنے بھی چاہے ہوں سخت باندھے ہوئے

کبھی اترتے نہیں دیکھا قبر میں راحت
کفن کے ساتھ کوئی تاج و تخت باندھے ہوئے

غزل

مسعود احمد

سچ مچ کا اختلاف نہیں جھوٹ موٹ ہے
تجھ سے ہمارا آج بھی رشتہ اٹوٹ ہے

تھوڑا بہت مبالغہ ہوتا تو خیر تھی
لیکن یہاں تو سارے کا سارا ہی جھوٹ ہے

اس پہ بھی اس کو دینا پڑا شک کا فایدہ
یہ جو ہمارے دل میں ہوئی ٹوٹ پھوٹ ہے

اک لفظ بولنے کی اجازت نہیں ہمیں
لیکن مداخلت کی کھلی اس کو چھوٹ ہے

شاید یہی کمال ہے رزق حلال کا
مہر و وفا جو ہم میں بھری کوٹ کوٹ ہے

گھر کو لگی ہے آگ یہ گھر کے چراغ سے
اپنے ہی گھر کو ہم نے لیا آپ لوٹ ہے

دن رات تھک گیا ہوں اسے جوڑ جوڑ کر
اندر سے کوئی چیز گئی مجھ میں ٹوٹ ہے

غزل

ساتھ کہنا بھی یہ پڑتا ہے کِدھر آیا ہوں؟
صرف آنے سے نہیں لگتا کہ گھر آیا ہوں

تیرے ذمے جو مری داد تھی، رہتی ہے ابھی
میرے ذمے جو تماشا تھا میں کر آیا ہوں

تو نے اب ہاتھ اٹھایا ہے نظارے سے مرے
اب کہیں جا کے میں دُنیا کو نظر آیا ہوں

باہر آیا ہوں دوبارہ جو تجھے دیکھنے کو
ساتھ اندر بھی تو میں بارِ دگر آیا ہوں

یہ اُدھر کا ہی مجھے کوئی بتائے تو بتائے
کتنا آنا تھا اِدھر ، کتنا اِدھر آیا ہوں

ایک بس تیری ہی آنکھوں سے گزرنے پر میں
جتنی آنکھوں سے گزرنا تھا گزر آیا ہوں

وہی دو چار قدم بنتے تھے اُلٹے سیدھے
اپنے سر آنا تھا اور اپنے ہی سر آیا ہوں

تو نے باتیں ہی مرے بارے میں ایسی کی ہیں
اتفاقاً ترے لہجے میں اُتر آیا ہوں

شاہین عباس

غزل

سر جُھکا کر قدمِ یار پہ قرباں ہونا
مری قسمت میں تھا اِس طرح مسلماں ہونا

جس کا مذہب ہو فقط دیدِ صنم یادِ صنم
جانتا ہے وہی کافر یا مسلماں ہونا

جس کا دل گیسوئے واہیل کے سایے میں رہے
اُسکو سجتا نہیں دُنیا میں پریشاں ہونا

اُن کی اُمت میں ہیں یہ فخر بجا ہے لیکن
ہم پہ لازم ہے ہر اِک رُخ سے مسلماں ہونا

زیرِ خنجر بھی نہ چھوڑے جو محبت کی زمیں
اُسکو کہتا ہے فلک صاحبِ ایماں ہونا

وہ طرب زار فضاؤں سے سدا دُور رہا
اُن کے غم میں جسے آتا نہ ہو شاداں ہونا

سُرخروئی کا سبب حُسنِ ندامت ہی تو ہے
اُن کو بھاتا ہے گناہوں پہ پشیماں ہونا

اِسی اعزاز سے افضل بھی ہُوا اعلیٰ بھی
اوج در اوج ہے جبریلؑ کا درباں ہونا

شوکتِ نعت نے بخشی ہے مجھے شانِ بلند
ورنہ مشکل تھا بہت میرا سخن داں ہونا

اُن کی صورت میں نظر آئے خدا کے جلوے
اُن کی سیرت کو بجا کہتے ہیں قرآں ہونا

کم تری عاجزی و خاک نشینی سبطین
ہے یہی عشق کی دنیا میں نمایاں ہونا

شاہ محمد سبطین شاہجانی

غزل

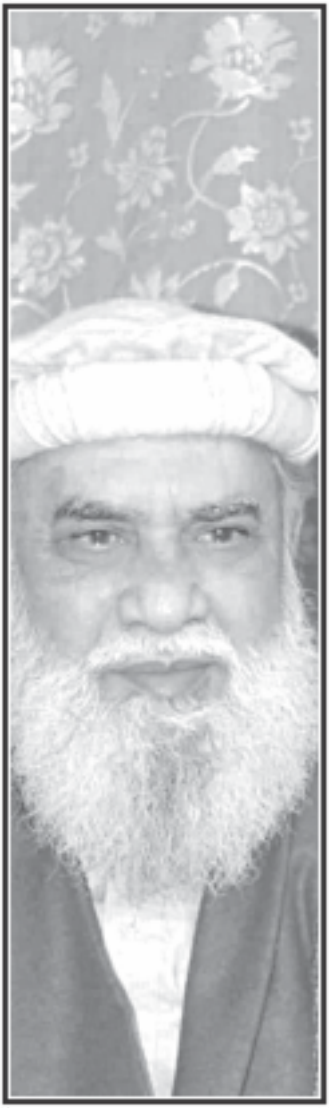

گلاب کوٹ کے کالر پہ وہ سجانے کے
زمانے بیت گئے تتلیاں اڑانے کے

یہیں پہ رہنا ہے غازی بنیں شہید بنیں
زمانے آ گئے پھر کشتیاں جلانے کے

نہیں سرشت ہی ایسی ہے یاں کے لوگوں کی
نہیں یہ لوگ نہیں آپ کو بچانے کے

بہت سی باتیں نہیں آپ کو بتانے کی
بہت سے شعر نہیں آپ کو سنانے کے

انہیں تو آتا تھا مطلب دیا بجھانے کا
ہیں اب تو صرف تکلف دیے بجھانے کے

ہمیں اتارا گیا اور ہی زمانے میں
کہ ہم تھے لوگ کسی اور ہی زمانے کے

اکرم ناصر

غزل

پینے، مے خانے میں شیخ آیا تھا، کیا بیچ دیا
مے کے اک گھونٹ کے بدلے میں، خُدا بیچ دیا

اس سے ملنے کی دُعا برسوں نہ جب پوری ہوئی
اتنا گھبرائے کہ پھر دستِ دُعا بیچ دیا

اَوڑھی جس دن سے ردا شعلے نے تاریکی کی
ہم نے اس روز ہی اس گھر کا دیا، بیچ دیا

ہم پہ اس روز سے اُترا ہی نہیں رزقِ سخن
ہم نے جس روز کوئی شعر لکھا، بیچ دیا

اس کے جانے سے مری کوڑی بھی قیمت نہ رہی
خود کو بازار میں جس بھاؤ بکا، بیچ دیا

تیری خوشبو سے تھا آباد مرا کمرہ بھی
بِن تیرے گھر مجھے اچھا نہ لگا، بیچ دیا

اک ترے پیار کی دولت کو بچایا ہے عقیل
ورنہ اس زندگی نے جو بھی دیا، بیچ دیا

عقیل رحمانی

غزل

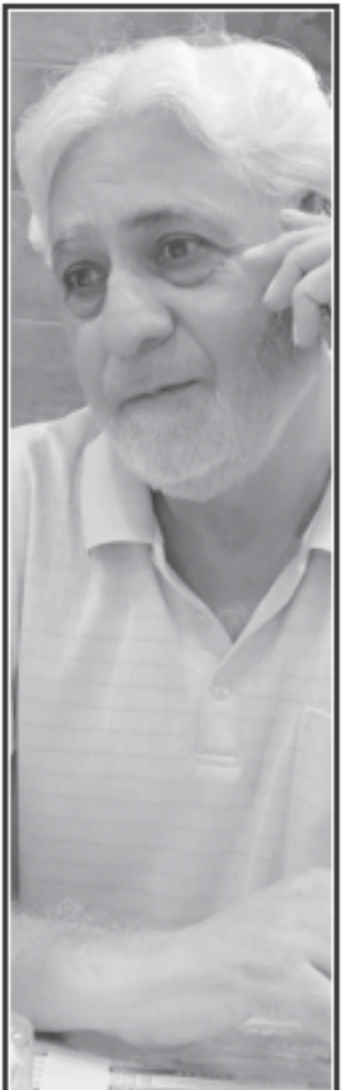

شعور خاک سے پیدا جہان لگتا ہے
مجھے یہ جسم نہیں خاکدان لگتا ہے

یہ تیرے فن کے نہیں جسم کے پجاری ہیں
تجھے تو سب سے بُرا قدردان لگتا ہے

ذرا سی چوٹ لگی تھی کسی زمانے میں
یہ کوئی زخم نہیں ہے نشان لگتا ہے

میں اِس جہاں کو اگر اُس جہاں سے دیکھتا ہوں
مکان والا مجھے بے مکان لگتا ہے

یہ میرے ساتھ عجب اِن دنوں معاملہ ہے
میں جس کو چاہوں وہی بدگمان لگتا ہے

میں کس سے ہاتھ ملاؤں کہ ہوں زمیں زادہ
ہر ایک شخص یہاں آسمان لگتا ہے

اقبال سرو بہ

غزل

جو مجھ سے کرتا رہا پیار اب کہاں میرا
وہ میرا یارِ وفادار اب کہاں میرا

تو کس طرح سے بنائے گا پرکشش اس کو
تری کہانی میں کردار اب کہاں میرا

میں کیا کروں بھلا اوصافِ یوسفی لے کر
بچا ہے کوئی خریدار اب کہاں میرا

تو کیسے مجھ سے یہ ہوتی ہے نت نئی تخلیق
حمایتی کوئی فنکار اب کہاں میرا

اگر خوشی نہیں تو غم کا آشیانہ بنا
وجود رہ گیا بیکار اب کہاں میرا

اٹھا رہا ہے کوئی اور فائدہ اس کا
کہ وہ درختِ ثمردار اب کہاں میرا

دیا ہوا تھا کبھی رب نے جو مرے مجھ کو
وہ طمطراق، وہ پندار اب کہاں میرا

اجل مجھے لئے جاتی ہے قبر کی جانب
مرے عزیز یہ سنسار اب کہاں میرا

مجھے اجل نے مری ماں سے کر دیا محروم
جہاں میں کوئی طرفدار اب کہاں میرا

بجائے آب جسے خوں سے سینچا تھا میں نے
وہ لالہ زار، وہ گلزار اب کہاں میرا

ذکی طارق

غزلیں

تمھاری یاد کی پرچھائیوں میں زندہ ہوں
شبِ فراق کی کٹھنائیوں میں زندہ ہوں

مجھے تو مار ہی دیتی یہ محفل آرائی
زہے نصیب! کہ تنہائیوں میں زندہ ہوں

ہجومِ اہلِ عداوت کے بیچ ہوں محصور
میں اپنے شہر کے بلوائیوں میں زندہ ہوں

فرازِ طور پر اپنا نہیں ہے شیش محل
نشیبِ ذات میں گم، کھائیوں میں زندہ ہوں

میں کھا رہا ہوں ازل سے فریب ہستی کا
میں کائنات کی پہنائیوں میں زندہ ہوں

کسی کنویں میں گرایا نہیں گیا ہوں ابھی
ابھی میں گھر میں ہوں اور بھائیوں میں زندہ ہوں

مری سرشت میں شوکت، ہیں خیر و شر دونوں
میں ان برائیوں، اچھائیوں میں زندہ ہوں

شوکت محمود شوکت

رنج و غم جتنے پڑے، جو جو پڑے
چپ رہے یا ہنس پڑے یا رو پڑے

تم کہ قائل فاصلوں کے تھے سدا
فاصلے اب جو بڑھے، کیوں رو پڑے

بھول جاؤ گے مزے سب وصل کے
ہجر کے گر بیچ لمحے دو پڑے

عشق سے مت روک ہم کو ناصحا!
حشر گر پڑنی ہے اک دن، تو پڑے

ایک تم سے تھا تعلق شہر میں
تم بھی آخر، غیر ہی کے ہو پڑے

بھاگ جب سوئے تھے ہم بیدار تھے
بھاگ جب جاگے تو شوکت، سو پڑے

غزل

رقص میں ہے فقیر کاغذ پر
کوئی تو ہے اسیر کاغذ پر

میں نے دو راستے بنائے ہیں
کھینچ کر اک لکیر کاغذ پر

مجھ سے غالب کلام کرتا ہے
جب بھی لکھتا ہوں میر کاغذ پر

کون دشمن ہے سامنے میرے
کس نے رکھے ہیں تیر کاغذ پر

کتنے رانجھوں نے اعتراض کیا
میں نے لکھا تھا ہیر کاغذ پر

طفل کب احتیاط کرتے ہیں
رینگتے ہیں شریر ، کاغذ پر

جب پرانے خطوں کو پڑھتے ہو
کیوں بہاتے ہو نیر کاغذ پر

دستخط کر کے جانے والے ہیں
سارے شاہ و وزیر ، کاغذ پر

میں نے اپنے لہو سے لکھا ہے
لفظ اک دل پذیر کاغذ پر

آئنے سے نکل کے آیا ہے
کوئی ماہِ منیر کاغذ پر

ضبط کے ٹوٹتے ہی بنتی ہے
آنسوؤں کی لکیر کاغذ پر

محمد نوید مرزا

غزل

کچھ نئے رنگ کے لفظوں سے سنوارو اس کو
وہ ہے شہکار تو غزلوں میں اتارو اس کو

اس کے جیسی کہاں کھلتے ہوئے پھولوں کی ادا
تم نے ہنستے ہوئے دیکھا ہے بہارو اس کو

دور پردیس میں شاید وہ کہیں سنتا ہو
اونچی آواز میں اک بار پکارو اس کو

کوئی دیکھے تو اسے دیکھتا رہ جاتا ہے
آسماں سے کبھی دیکھا ہے ستارو اس کو

وہ کہاں کونسی دنیا میں نہاں رہتا ہے
ڈھونڈ کے لادو کہیں سے مرے یارو اس کو

چاند اترا ہے محبت سے ندی کے اندر
تم نے رکھنا ہے حفاظت میں کنارو اس کو

تم اگر دیکھ لو تو ایک نظر کافی ہے
یہ ضروری تو نہیں جان سے مارو اس کو

اشرف کمال

غزل

طلعت شبیر

ایک تیرے خیال کا نقشہ
جیسے شہرِ جمال کا نقشہ

ہجر کے رنگ عارضی ہیں اگر
کیوں بنائیں ملال کا نقشہ

دکھ سناتے ہو کس مہارت سے
کھینچتے ہو کمال کا نقشہ

زرد رنگت ہے کھلتے پھولوں کی
کیا یہی ہے وصال کا نقشہ

آئنہ ٹوٹ کر بکھرنے لگا
تھا عجب میرے حال کا نقشہ

ثبت ہے میرے دل پہ سالوں سے
درد کے اک خیال کا نقشہ

ڈھونڈتا ہوں میں خال و خد اپنے
کھول کر ماہ و سال کا نقشہ

غزل

اب نہیں مجھ میں چاہتیں باقی
رہ گئیں تیری عادتیں باقی

بٹ گیا دل تو کرچیوں میں، پر
ہیں سبھی میں شباہتیں باقی

دیکھ بے نور ہو گئیں آنکھیں
ہیں مگر اِن میں حسرتیں باقی

پھول کلیوں میں اِس چمن کے اب
رنگتیں ہیں نہ نکہتیں باقی

میرے خوابوں میں اور کچھ بھی نہیں
یار کی ہیں شباہتیں باقی

کر چکا ہوں وضاحتیں ساری
پھر بھی ہیں کچھ وضاحتیں باقی

لذّتِ عشق کھو گئی لیکن
رہ گئی ہیں اذیتیں باقی

ایک مدّت سے چل رہا ہوں ندیمؔ
"اور ہیں کتنی منزلیں باقی"

ریاض ندیم نیازی

غزل

تُند دریا کے کنارو ، آؤ
مجھ کو کشتی سے اتارو ، آؤ

آس ، امید نے زندہ رکھا
میرے تنکوں کے سہارو ، آؤ

میری آواز ہوئی ہے معدوم
تم مرے ساتھ پکارو ، آؤ

زندگی رَنج میں میری گزری
سُکھ سے معمور نظارو ، آؤ

چاند،سورج نہیں درکار مجھے
ٹمٹماتے ہوئے تارو ، آؤ

خوشیاں الماری میں رکھ دو اپنی
اے غم و رَنج کے مارو ، آؤ

کنجِ تنہائی کو چھوڑو اجمل
زندگی ساتھ گزارو ، آؤ

اجمل اعجاز

غزل

فراق و ہجر کے ماروں نے اڑ ہی جانا تھا
وطن کی سمت پرندوں نے اڑ ہی جانا تھا

افق سے کوندتی کرنوں کی نیزہ بازی سے
سحر کے شبنمی قطروں نے اڑ ہی جانا تھا

گلوں کی کلیوں کی بازار میں ضرورت تھی
چمن سے تتلیوں بھنوروں نے اڑ ہی جانا تھا

یہاں تو غربت و افلاس ہی پنپتی ہے
دیارِ غیر کو یاروں نے اڑ ہی جانا تھا

عجیب اب کے تھا طوفانی بارشوں کا سماں
تمھارے پیار کے رنگوں نے اڑ ہی جانا تھا

اسی لیے تو رضا بلبلیں تھیں نوحہ کناں
گلاب رنگ بہاروں نے اڑ ہی جانا تھا

رضا اللہ حیدر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سبھی آنکھیں ہیں ، ہماری آنکھیں
گھل کے بہہ جائیں نہ ساری آنکھیں

غزل

چاند آدھا رہ گیا رات آدھی رہ گئی
بیٹھے بیٹھے کھو گئے ہم بات آدھی رہ گئی

وہ جدھر اٹھ کر گیا یہ اس ہی رخ پر چل پڑے
چند پل میں تاروں کی بارات آدھی رہ گئی

بے سبب مصروفیت نے اس طرح کھایا مجھے
ایسا لگتا ہے کہ میری ذات آدھی رہ گئی

بات وہ کرتا نہیں تو ایسا لگتا ہے مجھے
ہر خوشی جس طرح میرے ساتھ آدھی رہ گئی

وقت کی آندھی اڑا کر لے گئی کیا کیا نقوش
زندگی کی تتلی میرے ہاتھ آدھی رہ گئی

ٹھیک سے اس نے مری جانب کبھی دیکھا نہیں
میری تو ہر بار ہی خیرات آدھی رہ گئی

صلح کر لی ہم نے اک اور ڈر سے افتخار
جیت آدھی رہ گئی اور مات آدھی رہ گئی

افتخار شوکت

غزل

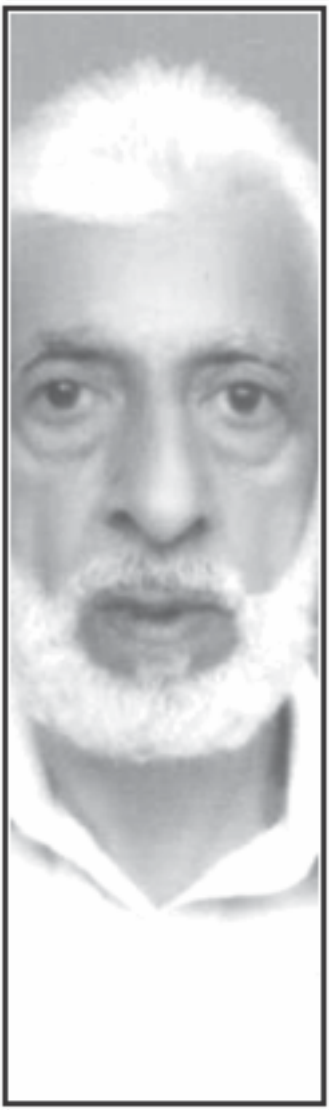

بنے گی آخرت خود ہی علم سچ کا اٹھا کے چل
بنانی ہے اگر دنیا تو دنیا سے بنا کے چل

سیاست اک عبادت ہے عبادت کر عبادت تو
سیاست کو تجارت کا حوالہ مت بنا کے چل

سکونِ جان و دل کی ہے تجھے گر آرزو تو پھر
کسی کو دے خوشی اپنی کسی کا غم اٹھا کے چل

مزاجِ وقت کچھ بھی ہو سلامت رکھ انا اپنی
تو اپنے بوجھ کو اپنے ہی کاندھوں پر اٹھا کے چل

خزاں کا دور بھی تجھ کو بہاروں کا مزا دے گا
گریباں چاک لوگوں سے تعلق تو بڑھا کے چل

سنہرا ذکر ہو تیرا سرِ تاریخ اے شاہد
ہنر کو چاند سورج کی طرح تو جگمگا کے چل

ہمایوں پرویز شاہد

غزل

کسی بھی کام کا کیوں ہم کو پھل نہیں ملتا
سوال ایسا ہے مشکل کہ حل نہیں ملتا

جو آج بیت گیا ہے وہ کل نہیں ملتا
ثُو جتنا بھی دلِ سادہ مچل ، نہیں ملتا

گذرتے جاتے ہیں احباب کتنی تیزی سے
بس ایک ہم کو پیامِ اجل نہیں ملتا

ہے پل میں تولہ تو پل ہی میں ہوگیا ماشہ
تمھارے جیسا سبھاؤ اٹل نہیں ملتا

بدل رہی ہے ہر اک روز زندگی پہلو
ذرا جو ہاتھ سے سرکا ، وہ پل نہیں ملتا

تلاش کرتی ہے پیہم ہماری روح ہمیں
کہ اپنی ذات کا نعم البدل نہیں ملتا

غمِ حیات سے چھوٹے ، اسیرِ عقبیٰ ہوئے
نیا تو کوئی، کہیں بھی، عمل نہیں ملتا

خالدہ انور

غزل

وہم ہے میرا یا اداسی ہے
زیست رقصاں ہے تال پر اسکی
عشق کی انتہا اداسی ہے
وقت کا معجزہ اداسی ہے

ہر طرف پھیلا ہے فسوں اسکا
کچھ نیا تھا تمہارے لہجے میں
خامشی کی ردا اداسی ہے
نم ہے گھر کی فضا؛ اداسی ہے

جاگتی شب ہے اور تنہائی
کاش تم چھوڑ کر نہیں جاتے
خواب کا سلسلہ اداسی ہے
دل کا ہر راستا اداسی ہے

دل کہیں بھی سکوں نہیں پاتا
جینے کا آسرا اداسی ہے

نائلہ راٹھور

انتخاب

دھوپ کی طرح بھوک برسے گی
دل نے بھی ایک قحط برتا ہے

- خالد احمد -

نعمان منظور

غزل

نہ جانے ہم کو زمیں پہ کس دم عنایتوں کا پتہ چلے گا
دلوں کے زنداں میں بین کرتی محبتوں کا پتہ چلے گا

یہ بات میں نے کسی ولی سے گئے زمانے میں سُن رکھی ہے
وہ دور آئے گا سب کے چہروں سے نفرتوں کا پتہ چلے گا

ابھی کشائش بنی ہوئی ہے تو شمعِ محفل بنے ہوئے ہو
جو دستِ غیبی نے ڈور کھینچی تو حسرتوں کا پتہ چلے گا

ابھی ہتھیلی کی سب لکیریں تمہارے ہاتھوں پہ مرتکز ہیں
جو آ گیا انتشار ان میں تو قسمتوں کا پتہ چلے گا

اگر یہ دنیا عروج پا کر بدن کی لذت سے ہٹ گئی تو
کتابِ دل میں بیان ہوتی روایتوں کا پتہ چلے گا

اگر شکم کے معاملے سے ذرا سی فرصت مجھے ملی تو
دماغ و دل میں پنپتی اٹھتی بغاوتوں کا پتہ چلے گا

جلالِ حشمت میں عابدی سب تمہارا سایہ بنے ہوئے ہیں
مصیبتوں میں کبھی گھرو گے تو دوستوں کا پتہ چلے گا

علی حسین عابدی

غزل

زحمتِ انتظار دیتے ہیں
کتنی تکلیف یار دیتے ہیں

دعوتِ اعتبار دیتے ہیں
واہ کیا اختیار دیتے ہیں

بدگمانی کی بھی کوئی حد ہے
دوست دشمن قرار دیتے ہیں

تم کو مجبوریوں کا شکوہ ہے
ہم تمھیں اختیار دیتے ہیں

اہلِ دل درد کی کٹھن گھڑیاں
مسکرا کر گزار دیتے ہیں

ایک غم کے معاوضے میں ہم
دولتِ صد قرار دیتے ہیں

تجربہ ہے کہ زندگی کے غم
زندگی کو سنوار دیتے ہیں

فکر کے پاک حادثے روشن
فن کی قدریں نکھار دیتے ہیں

اعجاز روشن

غزل

دل میں جو غم ہے اسے سب سے چھپانے کے لیے
یہ شبِ گریہ ہے رو کر مسکرانے کے لیے

آرزوئیں، خواہشیں، امیدیں ساری وصل کی
طاقِ جاں میں رکھ دی ہیں اک دن جلانے کے لیے

اس کی ہر اک بات کے ہوتے ہیں دو پہلو سدا
اک حقیقت کے لیے اور اک فسانے کے لیے

یہ مجھے معلوم ہے تیری کماں میں شامِ غم
تیر جتنے ہیں وہ ہیں مجھ پر نشانے کے لیے

اب تمنا کے فلک پر جگمگاتے ہیں بہت
میری امیدوں کے تارے ڈوب جانے کے لیے

ایسے ہی دل روتا ہے میرا تمہارے ہجر میں
جس طرح آنکھیں مری، آنسو بہانے کے لیے

پھر جلے افروز میرے دل میں الفت کے چراغ
پھر ہوائے غم چلی، ان کو بجھانے کے لیے

افروز رضوی

غزلیں

جہاں پنچھی کے اُڑ کر پر گئے ہیں
شجر اُس باغ کے سب ڈر گئے ہیں

کبھی وہ بد دعا دیں گے تجھے جو
تری محفل سے چشمِ تر گئے ہیں

یہاں اب نفرتوں کی ہے حکومت
محبت کرنے والے مر گئے ہیں

یہی آوارگی کی انتہا تھی
پلٹ کر لوگ اپنے گھر گئے ہیں

عابد معروف مغل

ماں لغزشوں پہ گرچہ مجھے ڈانٹتی رہی
لیکن دعا بھی میرے لیے مانگتی رہی

بیٹا پلٹ کے آئے گا آخر کو اپنے گھر
اک ماں تمام عمر یہی سوچتی رہی

اتری ہوئی تھی دھوپ مرے ہر مسام میں
بستر پہ مجھ کو دن کی تھکن کاٹتی رہی

اس جانِ جاں کے ہاتھ چھڑانے کی دیر تھی
تنہائی آ کے گھر میں مرے ناچتی رہی

وفاؤں کا صلہ مجھ کو ملا ہے
سبھی الزام میرے سر گئے ہیں

خدایا ان کو تو رکھنا سلامت
مرا دامن جو غم سے بھر گئے ہیں

ہر آنکھ ہی فریبِ محبت کے باوجود
کچھ چاہتوں کے خواب نئے دیکھتی رہی

کیسے کروں میں اب تری دنیا پہ اعتبار
عابد جو جھوٹ مجھ سے سدا بولتی رہی

غزلیں

جھوٹی گواہی کس نے دی پہچان کر مروں
اتنا تو میرا حق ہے خطا جان کر مروں

فطرت بشر کی ایک معما بنی رہی
قریہ یہ نفسیات کا میں چھان کر مروں

دنیا نہ جائے ہاتھ سے عظمیٰ سنوار لوں
انکار کر کے زندہ رہوں مان کر مروں

الجھن، تذبذب اور گماں میں کٹی ہے عمر
چادر یقیں کی کاش کہ میں تان کر مروں

جاذب کٹے گا عالم برزخ میں خوب وقت
تازہ سفر کی دل میں اگر ٹھان کر مروں

اکرم جاذب

جب تلک پاس یہ احساس کی دولت رہے گی
مائل گریہ یونہی اپنی طبیعت رہے گی

رفتہ رفتہ پھر اسی دھوکے میں آ جائیں گے
اور کچھ روز حسیں رنگ سے وحشت رہے گی

لاکھ غارت گرِ منظر سہی حالات کا جبر
گل و خوشبو میں جو قائم ہے وہ نسبت رہے گی

ماورا نفعوں خساروں سے تعلق رہے گا
خاک سے جن کو محبت ہے محبت رہے گی

یہی مفہوم مساوات سمجھ آیا ہے
زیردستوں پہ وڈیروں کی حکومت رہے گی

اس سرائے میں نہ دل اپنا لگانا جاذب
آپ کو چھوڑ کے جانے میں سہولت رہے گی

غزل

چاک میں کیا ہے کہ پیچاک میں کیا رکھا ہے
مجھ کو معلوم ہے افلاک میں کیا رکھا ہے

تُو نہیں ہے تو کسی ذات میں کیا رکھا ہے
ورنہ انسان کے اِدراک میں کیا رکھا ہے

چار حیلوں کے ہوا، چار بہانوں کے ہوا
تیرے دامن، تیری پوشاک میں کیا رکھا ہے

تیرے ارماں تری حسرت کے علاوہ ہم دم
میرے اس دیدۂ نمناک میں کیا رکھا ہے

دیکھنا تم کبھی ماچس کی جلا کر تیلی
راستے کے خس و خاشاک میں کیا رکھا ہے

سارا نشّہ ہے یہ دولت کا وگرنہ بھائی
تنگ دستی ہو تو خوراک میں کیا رکھا ہے

گھر کی رونق تو مکینوں سے ہُوا کرتی ہے
ورنہ رنگینیِ افلاک میں کیا رکھا ہے

ایک وحشت کے ہوا، ایک رعونت کے ہوا
چشمِ باطل دلِ سفاک میں کیا رکھا ہے

میری مٹّی کو ہواؤں نے اُڑا رکھا ہے
کُوزہ گر آپ کے اِس چاک میں کیا رکھا ہے

جھاڑ کر دیکھ مرے جسم سے تُو خاک نبیل
جاننا چاہتے ہو، خاک میں کیا رکھا ہے

نبیل احمد نبیل

غزل

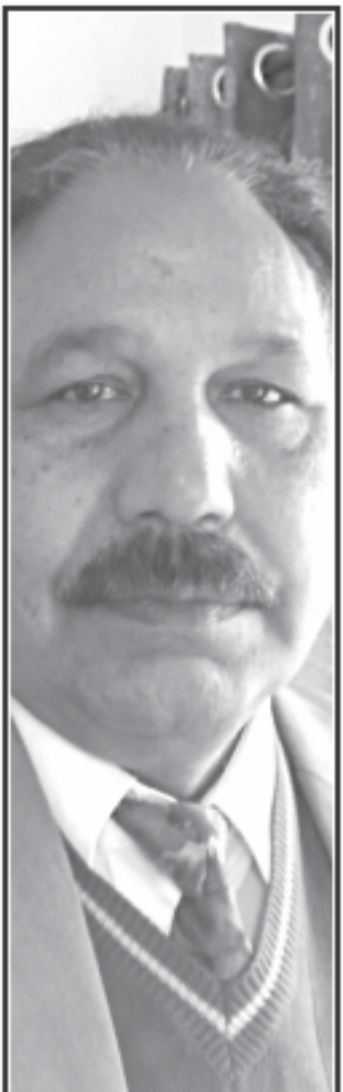

جیت کے بھی یہ ہار جاتی ہے
زندگی کی عجب کہانی ہے

آج تُو کل میں نے چلے جانا
کب ہوس نے یہ بات مانی ہے

زندگی خالی ہاتھ ہوں جس کے
کیوں سکندر مثل سنانی ہے

کرتے مزدوری ہیں میاں بیوی
اک ہے راجہ تو ایک رانی ہے

چیز ہر اک چھپا لے یہ مٹی
آدمی کے لیے نشانی ہے

کر دے نفرت دلوں سے کم محسن
لکھ غزل پیار کی سنانی ہے

میتھیو محسن

غزل

یتیم دل کو جو یہ سائباں میسر ہے
ترے خیال کا دارالاماں میسر ہے

انہیں بتاؤ کہ سپنوں میں کٹ گیا جیون
جنہیں گمان تھا ہم کو جہاں میسر ہے

بچا سکو تو بچالو بریدہ جان و جگر
جفا سرشت کو تیر و کماں میسر ہے

رہے ہیں گردشِ ایام کی معیت میں
سکونِ قلب کا لمحہ کہاں میسر ہے

تمہارے پاس بتاؤ ہے کیا خوشی کے سوا
ہمیں تو درد کا کوہِ گراں میسر ہے

جو کاٹتی چلی جاتی ہے ہر تعلق کو
ستم شعار کو ایسی زباں میسر ہے

ہمارے واسطے جینے کو درد کافی ہے
ہماری آنکھ کو آبِ رواں میسر ہے

کہانی شعر کے سانچے میں ڈھلتی جاتی ہے
کسی کی یاد کو حسنِ بیاں میسر ہے

دلوں کے کفر نہ ٹوٹے ہمارے صدیوں سے
سماعتوں کو اگرچہ اذاں میسر ہے

جہاں پہ روز بھرم ٹوٹتے ہوئے دیکھوں
ہماری آنکھ کو ایسا جہاں میسر ہے

ہمیں تو جو بھی ملا ہے دہائی دیتا ہے
تمہارے شہر میں کس کو اماں میسر ہے

تو کیا یہ کم ہے کہ قحط الرجال میں یارو
کسی حسین کو فیصل زماں میسر ہے

فیصل زمان چشتی

غزل

رہزن کی بھاگ دوڑ سے رستہ سمیٹ کر
لایا ہوں پھر سے راہ پہ دھوکا سمیٹ کر

تجھ سے مرا وجود سنبھالا نہ جا سکا
میں نے ترا غبار بھی رکھا سمیٹ کر

میں جس جہاں میں روشنی بن کر بکھر گیا
لاؤں وہاں سے تیرے لئے کیا سمیٹ کر

خلوت میں کیوں ہو غیر کی موجودگی کا رنگ
میرے حضور پیش ہو جلوہ سمیٹ کر

ردِ بلائے خوف تھی میری طلب رضا
میں نے سرہانے رکھ لیا کاسہ سمیٹ کر

نعیم رضا بھٹی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک شجر کے کوئی دو پتے بھی اک جیسے نہ تھے
میری دنیا میں کسی شے کا کوئی ثانی نہیں

غزل

غضنفر مہدی

جو تجھے سر پہ آسمان لگا
کرب کا مجھ کو سائبان لگا

جس قدر بدگماں وہ مجھ سے تھا
دوست ہی کوئی درمیان لگا

دھڑکنیں ہیں کہ برچھیاں چلتیں
سن کبھی میرے دل سے کان لگا

اب کوئی مستقل ٹھہرتا نہیں
دل کرائے کا اک مکان لگا

ہجر نے اس کو پاش پاش کیا
ورنہ وہ شخص تھا چٹان لگا

گاؤں والوں نے پیش ناری کی
تب کہیں جا کے کم لگان لگا

میں تو سچ کہہ کے بھی رہا نادم
جھوٹ وہ بول کر مہان لگا

کس قدر خوش مزاج تھا مہدی
وہ ترے بعد بد زبان لگا

غزلیں

دکھائی دیتا بھی کیا دور بینوں سے
نظر آیا نہیں کوئی مہینوں سے
کبھی تو سانپ تک باہر نکالے اور
کبھی تو یار نکلے آستینوں سے
مراد اپنی تو سیدھا سادہ مضموں ہے
معانی اپنی ہے باریک بینوں سے
تری شاخوں پہ آئے گا ثمر اپنا
غرض کوئی نہیں تیری زمینوں سے
گرا جیسے ترا معیار وحشت میں
گرے کوئی نہ پیارے ایسے زینوں سے

رویہ خیر والا اپنا بھی کب ہے
گلہ بنتا نہیں ویسے حسینوں سے
نصیحت کوئی کرتا ہے سر آنکھوں پر
مگر بنتی نہیں ہے نکتہ چینوں سے
مسائل بھی نئے پیدا ہوئے لیکن
ہوئے ہیں کام آساں بھی مشینوں سے
نہ ٹوٹے ہیں، نہ ثابت ہیں قمر اب کے
شکایت ہی نہیں ہے آبگینوں سے

قمر نیاز

پست کتنے ترے معیار ہوئے
مست جتنے تھے وہ بیزار ہوئے

بندہ کرتا ہے انا میں کیا کچھ
صلح جو کتنے کماں دار ہوئے

پھول ہوتے ہوئے مرجھائے کئی
دشت گردی میں جو گلزار ہوئے

مستقل کیا ہے، خوشی تو نہیں اب
جو ہنساتے تھے عزادار ہوئے

دوست ہو جاتے ہیں دشمن بھی یہاں
تیری نفرت میں جو حب دار ہوئے

ہضم ہوتی نہیں یہ بات قمر
شام والے سحر آثار ہوئے

غزل

جمال و حُسن پر اتنی رعُونت کیا کرو گے
دِکھا کر اِس قدر اپنی نزاکت کیا کرو گے

کہ جب تم اشک شوئی کر نہیں سکتے کسی کی
لگا کر قریہ قریہ یہ عدالت کیا کرو گے

میں پہلے ہی حیات و موت کی ہوں کشمکش میں
مجھے تم ہجر کی دے کر اذیّت کیا کرو گے

اگر تم آج ہی پہلو بچانا چاہتے ہو
مرے اچھے بُرے کی کل حمایت کیا کرو گے

نگر میں نفسا نفسی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے
خداوندا! یہاں لا کر قیامت، کیا کرو گے

گر ایسے دب گئے تم مُعتبر لوگوں کے ڈر سے
تو پھر ظلم و ستم کی تم مذمت کیا کرو گے

ہمارے لاڈ پر بیٹا! بہت اِترا رہے ہو
نہ مل پائی نئے گھر میں محبت کیا کرو گے

اگر بُت ہی سجے ہیں دل کے کعبہ میں بہر سو
تو پھر معبُودِ یکتا کی عبادت کیا کرو گے

تمھارے حق میں جب آ کر کھڑا کوئی نہیں ہے
زبردستی کسی دل پر حکومت کیا کرو گے

اگر دریا کنارے ہی رہے چلّوں میں مصروف
تو پھر بچّوں کی فرحاں تم کفالت کیا کرو گے

سرور فرحان

غزل

میرے خلاف اگرچہ یہ سب زمانہ ہے
تری عطا سے سلامت مرا گھرانہ ہے

زمانہ اس لئے سُنتا ہے گفتگو میری
ترے فقیر کا انداز شاعرانہ ہے

جو لحہ لحہ سوالات خود سے کرتا ہوں
یہ آئینوں سے محبت کا شاخسانہ ہے

جہاں کی دھوپ مرا کیا بگاڑ سکتی ہے
ترے کرم کا اگر سر پہ شامیانہ ہے

کمال یہ ہے کہ سب پر عطائیں جاری ہیں
اگرچہ اس کی نظر سب پہ طائرانہ ہے

مرے وجود میں دُنیا سما نہیں سکتی
ازل کے دن سے مری رُوح عارفانہ ہے

مستحسن جامی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مجھ سے طلوعِ صبح کے منظر چھپا گئی
ٹھنڈی ہوا چلی تو مجھے نیند آ گئی

غزل

میں کہ کچھ وقت ترے پاس بہانے سے رہا
حال دل اپنا تجھے پھر بھی سنانے سے رہا

مجھ سے آداب محبت کا تقاضا نہ کرو
ایک مدت سے میں ہوں کٹ کے زمانے سے رہا

چاند اُترا نہ مرے گھر میں اجالے لے کر
اور میں خود بھی کوئی دیپ جلانے سے رہا

اب تو کر مجھ کو گوارا یا مجھے اٹھوا دے
آ گیا ہوں میں تری بزم میں، جانے سے رہا

دور جا کر مجھے اشفاق نہ آوازیں دو
میں گیا وقت ہوں اب لوٹ کے آنے سے رہا

محمد اشفاق بیگ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

موت نے چھین لیا، رنگ بھی، نم بھی، خالد
آنکھ بھی سُوکھ گئی، ہونٹ بھی نیلے نہ رہے

غزل

خاک کا ذائقہ بھی چکھا ہے
چرخ سے واسطہ بھی رکھا ہے

قیمتی گھر کسی کا بھاتا نہیں
کُنج میرا ہی سب سے اچھا ہے

یہ کتابیں ہی میری ساتھی ہیں
بس تعلق انہی سے پکا ہے

خُونی رشتے بھی بودے نکلے ہیں
دوستوں کا بھی ساتھ کچا ہے

زندگی اُس پہ خرچ کر دی ہے
پھر بھی میرا اداس بچّہ ہے

جھوٹ بھی بے دریغ بولتا ہے
وُہ جو بستی میں سب سے سچا ہے

ماں کی آنکھیں مجھے ہی دیکھتی ہیں
ماں کا چہرہ ہی سب سے سچا ہے

ہارون رشید

غزل

سب بتا دے گا کھوٹا کھرا آئینہ
جب دکھائے گا سب کو خدا آئینہ

کتنا شفاف تھا جب بنایا گیا
رفتہ رفتہ جو دھندلا کیا آئینہ

ایک چہرے سے کتنے ہی چہرے بنے
میرے ہاتھوں سے کیا گر گیا آئینہ

تیری ضد ہے تو پوری کریں، آ ادھر
میں دکھاتا ہوں تو بھی دکھا آئینہ

اپنی بے چہرگی اس نے دیکھی نہیں
مر نہ جاتا اگر دیکھتا آئینہ؟

پارسا منہ چھپاتے پھریں گے سبھی
رند کے ہاتھ جب آ گیا آئینہ

بارہا یہ کہا اپنا چہرہ بدل
ورنہ لگتا رہے گا برا آئینہ

ٹوٹ کر میں صغیر آج خود پر کھلا
میں نے سمجھا جو پتھر وہ تھا آئینہ

صغیر احمد صغیر

غزل

سرفراز عارض

ہمیں کہتے ہیں تُم سے ہیں وہ اچھے
تُمھیں کچھ بھی نہیں آتا ہے پگلے

بدن کی سالخوردہ بالٹی میں
تمناؤں کے سو سو چھید نکلے

نچائیں ناچ تگنی کا بڑوں کو
ہمارے عہد کے چالاک بچّے

کہاں اب روئیں ہم پاسِ وفا کو
کسی نے توڑ ڈالے سارے رشتے

برنگِ مارِ اُفعی اُس حسیں کے
وہ زُلف اِک ریشمی عارض پہ لپکے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

حال دل کس طرح کہوں خالد
وہ مرا احترام کرتا ہے

غزل

تیری تو بات، بات سے، ہے مجھ کو اختلاف
ہر بات میں ثبات سے، ہے مجھ کو اختلاف

تیرے کرم سے آتی ہے، بدلے کی بو مجھے
سو! ان معاملات سے، ہے مجھ کو اختلاف

بیٹھے ہوں جس کی گھات میں، سارے گناہ گار
ایسی اندھیری رات سے، ہے مجھ کو اختلاف

ہو جن میں درجہ بندی، امیر و غریب کی
ایسے تعلقات سے، ہے مجھ کو اختلاف

ہر چال میں ہی مات ہو گل! میرے شاہ کی
ایسی بچھی بساط سے، ہے مجھ کو اختلاف

کوکی گل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اپنی پرستش میں گم تھا ہر کوئی خالد
شہر نہ تھا ، معبدِ بتانِ اَنا تھا

غزل

پانی بھرنے آگئی ہیں رانیاں
مشکلوں میں پڑ گئیں آسانیاں

عقل نے دل کو بنایا ہے رفیق
عقل بھی کرنے لگی نادانیاں

رونقیں خاموشیوں کی زد میں ہیں
شور کرنے لگ پڑیں ویرانیاں

دیکھ اس کا آسماں چھوتا مکان
دیکھ میری بے سر و سامانیاں

کام آئے ہر کسی کے مفت میں
مہنگی اب پڑنے لگیں ارزانیاں

جس طرف دل نے کہا، میں چل پڑا
اب تصادم لائیں گی من مانیاں

محمد آصف انصاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

موسم پسِ دیوارِ مہ و سال نہ بدلا
خالد! وہی آنکھیں، وہی کاندھا، وہی سر ہے

غزل

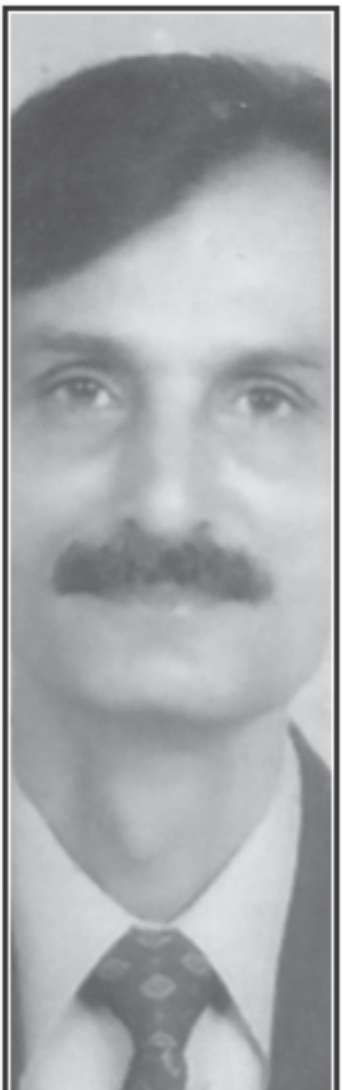

رات تمام ہو گئی بات تمام ہو گئی
دونوں بضد رہے ملاقات تمام ہو گئی

ہم کو فقیہِ شہر سے اور تو کچھ گلہ نہیں
اچھا ہوا اگر خرافات تمام ہو گئی

ڈھلتے وہ آفتاب کا دیکھا عجیب رنگ تھا
ساکھ تباہ ہوتے اوقات تمام ہو گئی

تمغے لٹانے سے ہوا سب پہ عیاں معاملہ
اپنے نوازے ہیں مساوات تمام ہو گئی

وعدہ خلاف بھی نہیں اور گلہ نہیں کوئی
آ نہ سکے وہ آج بھی رات تمام ہو گئی

ان کا اشارہ ہو گیا میرا حریف اٹھ گیا
دیکھا کہ کوششِ مہمات تمام ہو گئی

ختم کیا بھرا ہوا جام چلے امام ہم
جونہی وہ محفلِ خرابات تمام ہو گئی

مظہر امام

غزل

اے خدا بتا مجھ کو تجھ ترے جہاں بھر میں
کون ہے جو سمجھے گا خامشی کی گویائی

تہمتیں لگانا تو کھیل لمحے بھر کا ہے
عمر بھر نہیں ہوتی عزتوں کی بھرپائی

عقل کے غلاموں سے عقدہ وا نہیں ہوتا
عشق کیسے کرتے ہیں جانتے ہیں سودائی

روپ کیسے آیا تھا دھوپ کس نے کر ڈالا
مجھ سے پوچھتا ہے تُو واہ میرے ہرجائی

آپ کیوں نہیں پڑھتے داد کیوں نہیں دیتے
کام کس کے آئے پھر یہ سخن کی گویائی

ردا حاصل خلوص

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

گھلا مجھ پر درِ امکان رکھنا
مرے مولا ، مجھے حیران رکھنا

غزل

رات کھولے تھے جو یادوں کے خزانے اپنے
زخم تازہ ہوئے سارے ہی پرانے اپنے

میری غزلوں کی ہے دیوانی وہ لڑکی اِتنی
میرے دیوان کو رکھتی ہے سرہانے اپنے

اُس کے آنے کی خبر سُن کے سبھی دِل والے
تازہ پھولوں سے لگے گھر کو سجانے اپنے

عشق کرتے ہوئے اِک پل بھی نہ ہم نے سوچا
ہوں گے ہر ایک زباں پر ہی فسانے اپنے

وہ بھی اِک دَور جوانی کا تھا گزرا ہم پر
شہر کے سارے ہی کیفے تھے ٹھکانے اپنے

اب تو لگتا ہے کہ اِک پل بھی نہیں ہے اپنا
اِک زمانے میں تو سارے تھے زمانے اپنے

کارگر کوئی بھی تدبیر نہیں اب ہوتی
اتنے کچّے تو نہ ہوتے تھے نشانے اپنے

آج کا دن بھی مسائل سے اُلجھتے گُزرا
رات اچھی تھی کہ سپنے تھے سہانے اپنے

مَیں نے جن کو بھی کبھی حال سنانا چاہا
لگ پڑے رو کے وہی حال سنانے اپنے

دن نِکلتے ہی نِکل پڑتے ہیں گھر سے شاعر
ایک دوجے کو ہی اشعار سنانے اپنے

وقت آیا ہے ترا، اب نہیں ٹلنے والا
پاس اپنے ہی ضیاؔ رکھ لے بہانے اپنے

سید ضیا حسین

غزل

ہم کسی کے تھے وہ کسی کے تھے
ضبط کے امتحاں سبھی کے تھے

ہر کسی میں ہی ڈھونڈھنا ان کو
اب یہ معمول زندگی کے تھے

وقت بیٹھا تھا ان کے پہلو میں
رات ان کی تھی ، دن انہی کے تھے

وہ مخاطب ہوئے تو مجھ پہ کھلا
حرف جتنے تھے ، روشنی کے تھے

کھلتے کھلتے بھی کھل نہیں پائے
استعارے جو آگہی کے تھے

کوئی تو مسئلہ تھا ، گھر بھر میں
تم پہ الزام ہر کسی کے تھے

ہائے وہ لوگ جو حبیب نہ تھے
وائے وہ لوگ جو سبھی کے تھے

بشیر احمد حبیب

غزلیں

ہوا ہے سایۂ دیوار دشت میں تنہا
عجب مزاج کا سالار دشت میں تنہا

تمام عمر پھری ساتھ دربدر لیلیٰ
رہا نہ قیس طلبگار دشت میں تنہا

ازل سے ایک ضعیف آدمی سفر میں ہے
اٹھائے پشت پہ انبار دشت میں تنہا

ہوا نے کان میں ہولے سے کی ہے سرگوشی
کھڑی ہے نرگس بیمار دشت میں تنہا

رواں دواں ہے فرات اور کوئی پیاسا ہے
قضا سے برسرِ پیکار دشت میں تنہا

چمک رہا ہے کوئی چاند بادلوں کے بیچ
گھٹا کے بیچ علمدار دشت میں تنہا

عذاب دھوپ تھکن پیاس ناامیدی میں
بس اک درخت ہے غمخوار دشت میں تنہا

ہم ایک روز یہ دریا عبور کر لیں گے
ملیں گے آپ کو اس پار دشت میں تنہا

عجب ہے رسم زمانہ کہ اس ضعیفی میں
ہے آج حر سا وفادار دشت میں تنہا

اورنگزیب حسام حر

سر میں سودا نہ ہوس کیش ہوا پاگل پن
ریگ صحرا سے ملا عقدہ کشا پاگل پن

ضرب تیشے کی پڑے دل پہ تو فرہاد کہے
دودھ کی نہر نکالے گا مرا پاگل پن

چاند سورج ہیں حقیقت میں بہت دور مگر
ان کی خواہش تو نہیں بے سروپا پاگل پن

روز ہواؤں میں اچھالے نہ مداری پتھر
لوگ دیکھیں گے تماشا کہ نرا پاگل پن

کوئی تصویر نہیں سرو سمن کی محفوظ
لے اڑی صحن چمن سے بھی صبا پاگل پن

اپنی وحشت کا اندھیروں سے دلاتی ہے یقیں
یوں دکھاتی ہے چراغوں کو ہوا پاگل پن

ایک اک شخص لئے ذہن الگ آیا ہے
اور درویش نے پایا ہے جدا پاگل پن

غزل

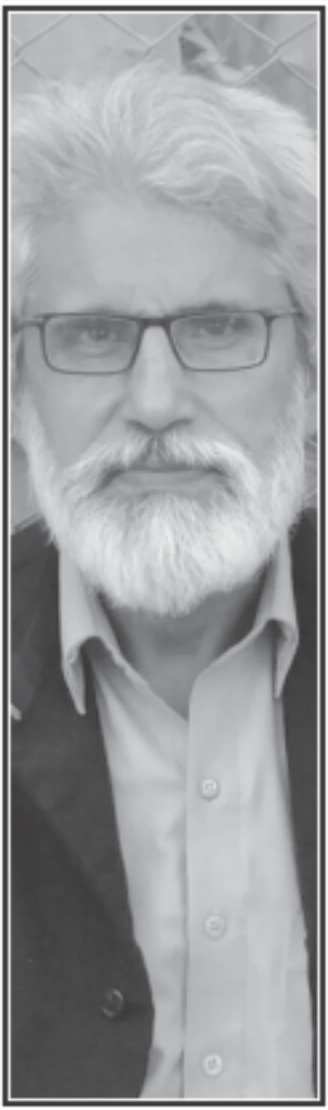

ہم اپنی نظر سے کہاں دیکھتے ہیں
"تمہاری نظر سے جہاں دیکھتے ہیں"

مہذب ہے کتنا کوئی اہلِ محفل
لبادہ نہیں ہم زباں دیکھتے ہیں

جہاں سے ملے کچھ خلوص و محبت
چلو کوئی ایسی دکاں دیکھتے ہیں

یہ زندہ دلی کا نتیجہ ہے پیارے
کہ ہر پل جو دل کو جواں دیکھتے ہیں

جو حق میں ہمارے عدالت میں آئے
بدلتا ہم ان کا بیاں دیکھتے ہیں

کہاں لے کے آئی بصارت ہماری
کہ ہر گھر سے اٹھتا دھواں دیکھتے ہیں

انہیں مال و دولت سے مطلب ہے یارو
غریبوں کی جانب کہاں دیکھتے ہیں

جو کرتے ہیں سودا محبت کا افضل
کہاں پھر وہ سود و زیاں دیکھتے ہیں

افضل ہزاروی

غزل

مستقل کیفیت جنونی ہے
بے سکونی سی بے سکونی ہے

کوئی آہٹ سی ہے نہ سایہ سا
دل کی رہ داری سُونی سُونی ہے

روح میں لُو سی چل رہی ہے کیا
رُت دسمبر بھی مجھ کو جُونی ہے

صبح دیکھی مری ہوئی تتلی
جانے کس دُکھ کی بدشگونی ہے

ہُوں طلسمی فضا میں قید امر
دُکھ حقیقی سزا فسونی ہے

امر مہکی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد ، خلا خلا وہی سودائے آگہی
صحرا نورد راہیٔ افلاک ہو گئے

غزل

اے مرے ہم نشیں تماشا ہے
زندگی اک حسیں تماشا ہے

یہ تو بس کھیل ہے گھڑی بھر کا
وہ جو زیر زمیں تماشا ہے

جو مری زندگی میں آئے ہیں
بیٹھ جائیں یہیں تماشا ہے

جسم کا جسم دل پہ ہنستا ہے
اس جہاں میں زمیں تماشا ہے

لامکاں کے تماشبین ہیں سب
اور مکاں کا مکیں تماشا ہے

یا تو محراب ہے یا داغ قمر
چاہے کچھ ہے جبیں تماشا ہے

تم قمر دل پہ ہی لے بیٹھے ہو
یہ محبت نہیں تماشا ہے

قمر بشیر

غزل

کام مشکل بہت تھا جو میں کر گیا
کون کہتا ہے میں ہجر سے ڈر گیا

ہم تو جینے کا دکھ سہہ رہے ہیں ابھی
کتنا خوش بخت تھا چین سے مر گیا

رات بھر شہر میں ؛ میں پھرا بے سبب
روشنی پھیلنے جب لگی ؛ گھر گیا

زندگی بوجھ تب سے بنی اس قدر
جب خسارے مرے نام وہ کر گیا

جو ترستا محبت کی شدّت کو تھا
جب محبت اچانک ملی ؛ مر گیا

میں نے خود میں کچھ اس طرح وحشت بھری
تیرے ہی خواب میں آج میں ڈر گیا

زین بیراگی ہے آج تو اس لیے
تجھ کو پانے کی خواہش میں در در گیا

عبدالرؤف زین

غزل

نیتِ اہلِ جنوں جب بھی بہک اٹھتی ہے
وادیِ شوق کی ہر چیز مہک اٹھتی ہے

میں چھپاؤں بھی تو کس طرح گلابی ڈورے
آنکھ جب منظرِ رنگیں سے چمک اٹھتی ہے

حرفِ اظہار کا محتاج نہیں پیار مرا
کیسے چھپ سکتی ہے جب آگ بھڑک اٹھتی ہے

چند لفظوں سے کِھلے شاخِ تمنا پہ گلاب
گونج سنتی ہوں تو ہر سانس مہک اٹھتی ہے

کسی خطے میں بھی خوں ریز تصادم ہو جیا
خود بخود ہی رگِ احساس پھڑک اٹھتی ہے

جیا قریشی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر شخص اجل بن کے اُسے دیکھ رہا تھا
وہ شخص کہ ہم سب کے لیے سینہ سپر ہے

غزل

گلشن میں اب کے سارے دعا مانگنے لگے
سب آسماں سے بادِ صبا مانگنے لگے

غفلت سے اپنی گل کیے سب علم کے چراغ
پھر تیرگی سے لوگ ضیا مانگنے لگے

ہم ہیں اسی قبیلے سے جس سے کہ میر تھے
ایذا رساں سے اپنی دوا مانگنے لگے

میری برہنگی کا اڑاتے تھے جو مذاق
اپنے لیے وہ مجھ سے قبا مانگنے لگے

آخر کو یہ ہوا کہ سبھی منصفانِ شہر
اپنے کیے کی آپ سزا مانگنے لگے

لذت فراقِ یار میں ایسی کہ اہلِ عشق
جتنا لکھا تھا اس سے سوا مانگنے لگے

بارود سے تھی کوکھ اجاڑی اور اس کے بعد
بنجر زمیں سے اپنی بقا مانگنے لگے

سورج کو دفن کر کے جو لوٹے گھروں کو لوگ
ظلمت سے خوف کھا کے دیا مانگنے لگے

یہ شہرِ بے ہنر ہے یہاں کس لیے عطا
اپنے ہنر کا آپ صلہ مانگنے لگے

عطاالعزیز

غزل

جنگل میں اک شہر بسایا جائے گا
صحرا کو گلزار بنایا جائے گا

پھر یوں ہو گا دین کے دعویداروں کو
نیزے پر قرآن سنایا جائے گا

کام آئے گا مولا کا انکار وہاں
لفظ بیعت جب دہرایا جائے گا

ذرے ہوں گے خون سے جب سیراب تو پھر
دشت گلابوں سے مہکایا جائے گا

پیاس سجائی جائے گی آنکھوں میں اور
دریا والوں کو اکسایا جائے گا

رجب علی رجب

انتخاب

خالد احمد

عمر بھر دکھ رگوں میں بھرتا ہے
جان لے کر ہی دل ٹھہرتا ہے

نعمان منظور

غزل

آگ میں پھولنے پھلنے کا ہنر جانتے ہیں
نہ بجھا ہم کو کہ جلنے کا ہنر جانتے ہیں

آبشار اپنا بھی، قدموں میں ہمارے رکھ دے
ہم چٹانوں سے پھسلنے کا ہنر جانتے ہیں

سیدھے ہاتھوں نے جو کھینچی ہیں لکیریں ٹیڑھی
ان لکیروں پہ بھی چلنے کا ہنر جانتے ہیں

ہم وہ لمحہ ہیں کہ مربوط ہیں صدیاں ہم سے
وقت کی گود میں پلنے کا ہنر جانتے ہیں

خوار ہم کو اسی شائستہ انا نے رکھا
کیوں نہ گرتے کہ سنبھلنے کا ہنر جانتے ہیں

کیا سمیٹے گا ہمیں وقت کا گہرا دریا
ہم کناروں سے اچھلنے کا ہنر جانتے ہیں

تو نشانہ تو لگا ہم بھی کماں ہیں تیری
تیر کی زد سے نکلنے کا ہنر جانتے ہیں

منزلیں بھی ہمیں گمراہ نہیں کر سکتیں
رستہ و موڑ بدلنے کا ہنر جانتے ہیں

جسم رکھتے ہیں جو سیال معانی سا اگر
قالبِ لفظ میں ڈھلنے کا ہنر جانتے ہیں

محمد اکبر نیازی

غزل

دُھوم مچی افلاک میں ہے
آخر کچھ تو خاک میں ہے

کانٹوں میں گُل کھلتا ہے
جُرأت اِس بے باک میں ہے

صُورت صُورت ڈھل جاتا
رَگ میں ہے یا چاک میں ہے

ہائے کیسی خوشبو آج
تیری اِس پوشاک میں ہے

مجنوں کو معلوم نہیں
جو اُلجھن اِدراک میں ہے

مٹی کا اِک گھر ہے اور
ایک ستارہ تاک میں ہے

امجد مرید حیدری

زندگی کربلا سے گزرے گی
دیکھ لینا ! قضا نہ ہو جائے

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

غزل

اب تماشا ہی تماشا ہے ہر اک سو جاناں
سب بت و بت گر و بت زاد ہیں ہم خو جاناں

گلشنِ اذنِ خدا میں ہے ہر اک سو ماتم
بلبلیں مرگ نشیں، زاغ ہیں کو کو جاناں

کون کہتا ہے محبت کے چلن ہیں باقی
باغ خاکی میں ہوا ہر کوئی دو رو جاناں

ہے چلی اب کے یہاں ایسی ہوائے مسموم
ہے تڑپتا دلِ مغموم ہو خوشبو جاناں

دور گذرے ہیں بہت تشنۂ خونِ آدم
اور نکلے ہیں تعفن سے وہ بد رو جاناں

آہنِ رمز کشائے غمِ افکار و جنوں
ہائے کرتے ہوئے کہتا ہے وہ ہو ہو جاناں

اخلاق آہن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

نہ مضطرب ہو، غمِ جاں گزیں! یہ میں تو نہیں
لہو میں، سنگ و سرو آستیں، یہ میں تو نہیں

غزل

عابد رضا

اندھیرا آسماں کے تھال سے گرنے لگا ہے
ستارے دم بخود ہیں آج سورج بجھ گیا ہے

اُسی محضر میں ہیں شہزادگانِ دست بستہ
جہاں دربان اب مسند پہ اُکڑوں بیٹھتا ہے

عجب لمحہ ہے آپس میں فرشتے لڑ پڑے ہیں
قدیمی عہدناموں میں نجانے کیا لکھا ہے

نحوست کی پچھل پائی بلائیں لے رہی ہے
نصیبوں کے بڑے گنبد پہ اُلّو بولتا ہے

فصیلِ شب پہ روشن ہیں روپہلی کہکشائیں
بس اک تاریک روزن ہے جو اندر کھینچتا ہے

لہو کی گردشوں میں ہیں کئی نسلوں کے بھیدی
ہمارا جسم ہے یا جینیاتی معرکہ ہے

جواں نکلا تھا کوئی وقت کے خیمے سے باہر
زمانے کی طنابوں میں الجھ کر گر پڑا ہے

اکیلی رات ہے اور سر پہ اک دُم دار تارا
مرے پہلو میں بھوکا اژدھا پھنکارتا ہے

غزل

اداس اور منجمد سا وقت ہوگئے ہیں ہم
کسی کے انتظار میں درخت ہوگئے ہیں ہم

یوں لگ رہا ہے جیسے ختم ہوگئے ہیں رنج و غم
وہ خود فریبیاں ہیں نیک بخت ہوگئے ہیں ہم

ورق ورق پہ جس کے صرف درد ہے لکھا ہوا
ادھوری کرب ناک سرگزشت ہوگئے ہیں ہم

کبھی لگا کہ پیچھے رہ گئے صراطِ وقت سے
کبھی کبھی لگا کہ ساز و رخت ہوگئے ہیں ہم

گزر گئے تھے اس کے شہر سے بڑے سکون سے
پلٹ کے جو نہ آسکا وہ وقت ہوگئے ہیں ہم

غموں کی دھوپ نے جلا دیا ہے سر سے پاؤں تک
گمان تک نہیں ہوا کہ دشت ہوگئے ہیں ہم

ملے تھے اُس سے جب تو مجتمع تھے اپنے آپ میں
سحر پھر اس کے بعد لخت لخت ہوگئے ہیں ہم

نادیہ سحر

غزل

خاک بن کر دشت میں تحلیل ہونا پڑ گیا
وقت بدلا تو مجھے تبدیل ہونا پڑ گیا

پہلے پہلے صرف آنکھوں پر گزارا تھا مرا
اس کی خواہش پر مکمل جھیل ہونا پڑ گیا

اپنے دل کی میں نفی کرتا رہا پھر ایک روز
اس کے ہر اک حکم کی تعمیل ہونا پڑ گیا

میں وضاحت سے بہت گھبرا رہا تھا دوستو
اک غزل کی کھوج میں تفصیل ہونا پڑ گیا

بے سبب چلنا پڑا جب بے نشاں منزل کی سمت
چند قدموں کے سفر کو میل ہونا پڑ گیا

اسد رضا سحر

خود اُلجھتا ہوں ، خود سُلجھتا ہوں
کچھ نکھر جاؤں ، کچھ سنور جاؤں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

غزل

اک پل نہیں کہ جب مَیں تجھے پُوجتا نہیں
تُو دل پہ نقش ہے سو مجھے بھولتا نہیں

ہر دم دل و دماغ پہ طاری ہے تیرا عشق
تیرے علاوہ کچھ بھی مجھے سوجھتا نہیں

اتنا تجھے یقین ہے میری وفاؤں کا
بُھولے سے بھی کبھی تُو مجھے پوچھتا نہیں

تُو وہ سوال جس کا سبھی دے چکے جواب
میں وہ پہیلی جس کو کوئی بوجھتا نہیں

نعمان آسمانی صحیفے سا ہے وہ شخص
پڑھتا نہیں مَیں جب تک اُسے چومتا نہیں

نعمان محمود

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

رنگ کہتے ہیں کہانی میری
کس کی خُوشبُو بھی جوانی میری

غزل

اگرچہ سایہ بہت واجبی شجر کا ہے
مگر یہ مسئلہ ہر ساحلی شجر کا ہے

وہ جس کو پیار بلاتے ہیں اہلِ ظرف و ہنر
یہ احترام بھی ثمرہ اسی شجر کا ہے

بھلائی ہونے لگی ہے زمین پر ناپید
یہ برگِ زرد کسی آخری شجر کا ہے

الٰہی خیر کہیں برق گرنے والی ہے
رویہ آج بہت شبنمی شجر کا ہے

حبیبِ خاص اسے ہونا چاہیے اس کا
عدوئے جان مگر آدمی شجر کا ہے

شرابِ دید پیے لوگ جانتے ہی نہیں
جو سر پہ سایہ ہے وہ کاغذی شجر کا ہے

علاوہ اس کے نہیں تھا کوئی اگر ہمراز
قصورِ شور میں پھر واقعی شجر کا ہے

کسی کو سائے سے روکا نہیں کبھی اس نے
گریز آپ نے دیکھا کبھی شجر کا ہے؟

بجا زمانے کی حیرت قمر تغزل پر
کہ یہ ثمر تو کسی سرمدی شجر کا ہے

قمر آسی

اختر حسین جعفری ___ اُردو نظم کا اُجالا

دسمبر 1983 کی ایک خنک شام کا ذکر ہے میں اسلام پورہ سے پیدل چلتا ہوا میکلوڈ روڈ کنگ ایڈورڈ کالج ہوسٹل کے ساتھ گھاٹی چڑھ کر ایک بند گلی میں واقع رسالہ فنون کے دفتر پہنچا، دہلیز پر ٹھہر کر ایک لمبا سانس لیا اور پھر اندر جھانکا تو کمرے کے ایک کونے میں عبداللہ قریشی صاحب اپنے پرانے خطوط کی ترتیب لگانے میں مصروف تھے اور دوسری طرف احمد ندیم قاسمی صاحب کی بڑی میز کے پاس صوفے پر اختر حسین جعفری سفید شلوار قمیض اور کالی واسکوٹ پہنے سنہری فریم کی عینک لگائے ایک ہاتھ میں فونٹین پن پکڑے زانو پر کچھ بھاری کتابیں رکھے کسی گہری سوچ میں گم تھے۔

میں نے دروازے پر دستک دی جعفری صاحب نے چونکتے ہوئے مجھے دیکھا اور مسکراتے ہوئے مخاطب ہوئے جی فرمائیں میں نے جواب دیا خالد صاحب سے ملنا تھا۔ جعفری صاحب نے اپنا رُخ عبداللہ قریشی کی طرف کیا اور کہا قریشی صاحب خالد احمد نے کدوں آنا اے۔ عبداللہ قریشی اپنے کام میں مگن رہے کچھ وقفے کے بعد اختر حسین جعفری نے قدرے بلند آواز میں، لفظ صاحب کو کھینچتے ہوئے کہا، قریشی صاحب خالد احمد نے کدوں آنا اے۔ عبداللہ قریشی نے پہلے عینک کے اوپر سے جعفری صاحب کو گھورا، پھر کندھوں سے سر نکالا، خطوط کا ڈھیر ایک طرف رکھا۔ آنکھوں سے عینک اُتاری جیب سے رومال نکالا پھر بڑے اطمینان سے اپنا منہ صاف کیا اور دونوں ہاتھ لہرا کر کہا۔ خالد دا کوئی پتہ نہیں،

اختر حسین جعفری نے قریشی صاحب کا جواب سنا تو ہنستے ہوئے کہا

آجاؤ، آجاؤ

تُسی اندر آجاؤ خالد دی آ جائے گا، میں کمرے میں داخل ہوا تو بولے

آؤ بیٹھو، بیٹھو، میں جعفری صاحب کے

اعجاز رضوی

کہنے پر قریب کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ جعفری صاحب اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ شاید وہ کسی قانون کی کتاب سے کوئی ریفرنس ڈھونڈ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ایک قہقہہ سنائی دیا تو جعفری صاحب نے چونکتے ہوئے میری طرف دیکھا اور فرمایا، جناب خالد احمد صاحب آ گئے۔

اتنی دیر میں خالد احمد صاحب کمرے میں داخل ہوئے ہاتھ میں پکڑا ہوا شوپر صوفے پر رکھا، پینٹ اوپر کی۔ ہاتھ اٹھ کر بلند آواز میں 'السلام علیکم' کہہ کر صوفے پر بیٹھ گئے پھر مشترکہ 'وعلیکم السلام' سن کر خالد احمد نے کہا جیتے رہو بچو، جیتے رہو یہ سن کر، عبداللہ قریشی اور اختر حسین جعفری دونوں نے خالد احمد کو گھورا، مگر وہ مسکراتے ہوئے مخاطب ہوئے، ہوسنا اعجاز رضوی کی حال اے۔

اختر حسین جعفری صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں پھر چونکتے ہوئے فرمایا اعجاز رضوی، خالد احمد مخاطب ہوئے جی جعفری صاحب اعجاز رضوی تسی کی سمجھیا اے، صرف تسی جعفری او، جناب عالی اجے تے اعجاز رضوی آیا اے، فیر قائم نقوی آئے گا فیر گلزار بخاری آئے گا فیر حسن رضوی آئے گا، فیر خود احمد شاہ آئے گا تے اس طرح فنون دا دفتر یکدم امام بارگاہ بن جائے گا۔ تے تسی مینوں گھوڑا ہی سمجھو

خالد احمد نے جتنا زور دے کر کہا مینوں گھوڑا ہی سمجھو جعفری صاحب نے اتنی ہی شدت سے خالد صاحب کو گھورا اور بولے، خالد میں تینوں گھوڑا انہیں سمجھدا یہ سن کر خالد صاحب نے قہقہہ لگایا تو جعفری صاحب بولے بک بک نہ کریا کر بک بک نہ کریا کر جعفری صاحب صرف اُن لوگوں کو کہتے تھے جن سے وہ بہت بے تکلف ہوتے تھے خیر جعفری صاحب نے بات مکمل کی اور کہا چل ہن چا دا بندوبست کر، مہمان آئے نیں، پھر مجھے مخاطب کیا محترم جناب اعجاز رضوی صاحب کی حال اے۔

محترم صاحب جناب کے ساتھ پورا نام لینا اور نوجوانوں کو عزت و احترام دینا جعفری صاحب کی فطرت کا حصہ تھا۔ اختر حسین جعفری دبلے پتلے جسم اور توانا روح کے ساتھ ہر جگہ آتے جاتے، شام میں رسالہ فنون، ٹی ہاؤس، شیزان کیفین ہوٹل ان کے ٹھکانے تھے۔ دوپہر میں وہ مجلس ترقی ادب کے دفتر تشریف لاتے اس زمانے میں مجلس ترقی ادب ادیبوں شاعروں کا ایک پکا ڈیرہ تھا۔ یہاں دو بجے کھانے کا اہتمام ہوتا، دو بجے سے پہلے پہلے احباب چائے بسکٹ کی تواضع اور ندیم صاحب کی گفتگو کا لطف اٹھا کر چلے جاتے، جو رہ جاتے وہ یقیناً کھانا کھاتے، جس دن اختر حسین جعفری مجلسِ ترقی ادب کے دفتر تشریف لاتے اس دن ندیم صاحب آرام نہیں کرتے تھے۔ اور بہت اصرار کے ساتھ جعفری صاحب کو مجبور کرتے کہ وہ بیٹھیں کھانا کھائیں۔

کھانا کھانے کے معاملے میں اختر حسین جعفری بہت محتاط تھے۔ خود بھی کم کھاتے اور دوسروں کو بھی کم کھانے کا مشورہ دیتے۔ دل کی

تکلیف کے بعد اپنی پلیٹ میں سالن اس احتیاط کے ساتھ لیتے کے ذرا سی بھی چکنائی یا تری پلیٹ میں نہ آئی، پھر چکن بوٹی کو ٹیشو پیپر سے صاف کرتے اور پھر کھاتے۔ ایک دن کھانا کھاتے ہوئے جعفری صاحب نے چکن بوٹی کو ٹیشو سے صاف کیا تو منصورہ احمد نے کہا انکل اگر بوٹی کی جگہ قیمہ ہوتا تو کیا کرتے، جعفری صاحب نے حیرت سے منصورہ کو دیکھا ہی تھا کہ میں نے فوراً جواب دیا، بس ٹیشو زیادہ لگتے، جعفری صاحب نے یہ بات سنی تو ہنسنے لگے اور فرمایا بیٹی کے لیے یہ خرچا بھی منظور ہے۔

اختر حسین جعفری صاحب کھانے میں ٹینڈے گوشت پسند کرتے تھے ایک دن مجلس ترقی ادب میں راجہ نیر فوٹو گرافی بیان کر رہا تھا جعفری صاحب کوشش کر رہے تھے کہ شاعری پر بات کی جائے کچھ دیر تو میں نے راجا نیر کو نظر انداز کیا مگر پھر مجبوراً کہا، جعفری صاحب، آپ کو ٹینڈے گوشت پسند ہیں۔ جعفری صاحب نے فرمایا جی جی تو بس آپ گوشت کا بندوست کرلیں۔ ٹینڈا تو ساتھ بیٹھا ہے۔ جعفری صاحب نے بات سمجھتے ہوئے فرمایا اتنے زیادہ بھی ٹینڈے پسند نہیں۔

اختر حسین جعفری صاحب غالب، ایذرا پاؤنڈ، ٹی ایس ایلیٹ پبلو نرودا، اور اُردو کے بہت سے شعرا خصوصاً نوجوان شعرا کو بہت شوق سے پڑھتے تھے اور گفتگو میں نثری اور شعری حوالے بھی دیتے تھے۔ انھوں نے 1988 میں فردا کے نام سے ایک ادبی کتابی سلسلہ بھی شروع کیا، جو ادیبوں شاعروں کے تعاون نہ کرنے کی وجہ سے پہلے موخر ہوا پھر بند ہو گیا، فردا میں انھوں نے جدید ترین ادب کو پرموٹ کیا، وہ انگلینڈ ناروے، امریکہ کے شعرا کو پڑھنے کے بعد اُن کا موازنہ اپنے کلاسیک شعرا سے کرتے، پھر بلھے شاہ، میاں محمد بخش، وارث شاہ، شاہ حسین کی بات کرتے، کہیں کوئی ان کی نظموں کی تعریف کرتا یا انھیں بڑا شاعر قرار دیتا تو فرماتے۔

میں راہوں دا روڑا کوڑا
توڑ چڑھایا سائیاں

.....

اختر حسین جعفری کو مشاعرے اور مجالس سے بہت لگاؤ تھا، عام دفتری مجلس ہو مجلس دوستاں ہو یا مجلس عزا، اختر حسین جعفری ہر مجلس میں بہت دل سے شرکت کرتے مگر مجلس عزا میں اُن کا انداز ہی نرالا ہوتا، وہ کوشش کرتے کہ مجلس عزا میں بیان کردہ فضائل و مصائب کو زمین پر بیٹھ کر سنیں واہ واہ کم اور گریہ زیادہ کریں، وہ محرم کی مجالس میں اسلام پورہ تشریف لاتے تو میں کوشش کرتا کہ انھیں کرسی پیش کروں مگر وہ حسب عادت زمین پر بیٹھ کر مجلس سنتے، مشاعرے میں وہ نظم نگار شعرا کو غور سے سنتے، اور اچھی لائن اچھی نظم پر بار بار داد دیتے، اور پھر بہت سے مواقعوں پر، حوالہ بھی دیتے کہ فلاں شاعر اچھی نظم لکھ رہا ہے

فلاں کی نظم میں تازگی ہے۔

جس زمانے میں اختر حسین جعفری لاہور ریلوے سٹیشن پر کسٹم آفیسر کے فرائض ادا کر رہے تھے، اس زمانے میں معروف شاعر اقبال ساجد، ان کے پاس آئے، اور اپنے کام کی چیزوں کی فرمائش کرنے لگے۔ کچھ دیر تو جعفری صاحب نے اقبال ساجد کو سنا پھر بیل بجائی، عملہ اندر آیا تو جعفری صاحب نے فرمایا اک چھتر لے کے آؤ، اقبال ساجد نے جب چھتر کا سنا تو کچھ پریشان ہوئے اور اٹھ کر جانے لگے تو اتنی دیر میں سپاہی اخبار میں لپٹا ہوا ایک چھتر لے آیا، جعفری صاحب نے فرمایا، اس چھتر سمیت انھیاں نوں بار تک چھڈ آؤ۔۔۔

اقبال ساجد نے یہ لفظ سنے تو نہال ہو گئے اور کہنے لگے اچھا جعفری صاحب یہاں بار بھی ہے، جعفری صاحب نے ہنستے ہوئے کہا، بار سے مراد آپ کو ریلوے سٹیشن کی حدوں سے باہر چھوڑ آئیں، بس جلدی کریں کسٹم والوں کا چھاپا پڑنے والا ہے اقبال ساجد نے چھاپے کا سنا تو بولے میں تو چلتا ہوں مگر جعفری صاحب آپ کا کیا ہوگا، جعفری صاحب بولے آپ جایئے میں اپنا کچھ بندوبست کرتا ہوں۔

اُن کا یہ کہنا کے میں اپنا کچھ بندوبست کرتا ہوں، بتاتا ہے کہ ان کو کبھی بھی یہ شوق نہیں تھا کہ اُن کو بڑا افسر سمجھا جائے، وہ اپنی سرکاری نوکری کو روزگار کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اور علم و ادب کو اپنی کل کائنات آئینہ خانہ کے بعد کلیات جہاں دریا اترتا ہے اختر حسین جعفری کی وہ وراثت ہے جو اردو ادب کے لاکھوں قارئین میں تقسیم ہو کر بھی پوری کی پوری ہے اور ہر قاری یہ ہی سمجھتا ہے کہ اختر حسین جعفری کی مکمل وراثت کا مالک و مختار وہی ہے۔ یقیناً کسی قاری کا کسی شاعر پر حق جتانا ہی اس شاعر کے بڑے ہونے کی دلیل ہے۔

اختر حسین جعفری کے چلنے کا انداز ایسا تھا کہ اس کو سبک خرامی کہہ سکتے ہیں، شانوں کو ذرا سا جھکا کر چلتے، ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ پکڑے ایک ہاتھ کو واسکوٹ کی جیب میں ڈالے رکھتے، جیب اور بیگ میں ہمیشہ دس دس کے نوٹ ضرور رکھتے رسالہ فنون کے دیرینہ خدمت گار اختر لکھنوی ہر شام ان نوٹوں میں سے اپنا حصہ لیتے، احباب کی موجودگی میں جب کبھی خالد احمد صاحب اُن سے نوٹ کا مطالبہ کرتے تو کہتے یار خالد تیرا وی کوئی حال نئیں، خالد صاحب کہتے، حال نوں چھڈو، نوٹ کڈو نوٹ فیر ساڈا مستقبل ویکھو۔ جعفری صاحب ہنستے ہوئے جیب سے دس کا نوٹ نکال کر دیتے اور خالد احمد صاحب فرماتے، لوجی ہن چابن گئی،

اختر حسین جعفری دوسرے کی بات کو بہت توجہ اور مکمل آئی کونیکٹ کے ساتھ سنتے، کسی کے ناگوار ذکر پر کہتے چھڈو یار بڑا گھر اے۔

گھر ہو یا دفتر اپنے ماتحت لوگوں کے ساتھ بہت شفقت کا رویہ رکھتے، اگر کہیں جاتے تو

اپنے میزبان کو آگاہ کرتے کہ میرے ساتھ جو صاحب آئے ذرا اُن کو بھی چائے پانی پوچھ لیں۔ اگر کبھی مسلسل کچھ ناگوار دیکھتے یا ناگوار بات کو سنتے تو ذرا سے غصہ کا اظہار بھی کرتے، ایک دن احمد ندیم قاسمی صاحب سے ملنے کے بعد آفس سے باہر نکلے اور گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے اچانک رک گئے، اور پوچھنے لگے کہ عدیم ہاشمی صاحب منصورہ احمد سے کیوں ناراض ہیں۔

میں کچھ تفصیل بتا رہا تھا کہ اُن کے ڈائیور نے گاڑی اسٹاٹ کر دی، انھوں نے اشارے سے منع کیا، ڈرائیور گاڑی سے اُتر آیا کچھ دیر بعد، اس نے پھر وہی حرکت کی، تو جعفری صاحب نے ذرا بلند آواز میں فرمایا، یار توں کی لاڑا بن بن گڈی وچ بیٹھا ایں، صبر کر لے، صبر کر لے سے مراد ہے جعفری صاحب کا غصہ ختم ہو گیا۔

اختر حسین جعفری متحرک ترقی پسند شخصیات کو پسند کرتے تھے۔ اُن میں لیڈر پروفیسر، شاعر، مولوی اور عام لوگ شامل تھے۔ سیاست میں انھیں ذوالفقار علی بھٹو سے بہت محبت تھی، انھوں نے بھٹو صاحب کی شہادت 4 اپریل 1979 کے حوالے سے ایک نظم نوحہ کے عنوان سے لکھی اور فرمایا:

اب نہیں ہوتی دعائیں مستجاب
اب کسی ابجد سے زنداں ستم کھلتے نہیں
سبز بجادوں پہ بیٹھی بیبیوں نے
جس قدر حرف عبادت یاد تھے پوپھٹے تک
انگلیوں پر گن لیے
اور دیکھا
رحل کے نیچے لہو ہے
شیشہ محفوظ کی مٹی ہے سُرخ
سطر مستحکم کے اندر بست و در باقی نہیں
یا الٰہی مرگ یوسف کی خبر سچی نہ ہو

یہ نظم اور اس سے پہلے کی کچھ نظموں نے جنرل ضیا الحق کو پریشان کر دیا تھا۔ اس زمانے میں کرنل صدیق سالک، جنرل ضیا الحق کے سیکرٹری تھے۔ انھوں نے جنرل ضیا الحق کی فرمائش پر انھیں کچھ نظمیں سنا دیں، اور سمجھا بھی دیں جنرل ضیا الحق نے پہلی بار کوئی ادب پارہ پڑھا تھا، اس لیے حیران بھی ہوا، اور پریشان بھی، اس نے 1985 میں ہونے والی ادبی کانفرنس جس میں احمد ندیم قاسمی اور خود اختر حسین جعفری اور پاکستان کے معروف شعرا ادبا موجود تھے، ضیا الحق نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ یہ لوگ پاکستان کا کھاتے ہیں اور ایسی ملک دشمن اور انارکی پھیلانیوالی نظمیں لکھتے ہیں ان کو تنبیہ کرتا ہوں کہ وہ باز آجائیں ورنہ ان کا انجام صحیح نہیں ہوگا۔

جنرل ضیا الحق کا بیان سن کر جعفری صاحب کو سخت غصہ آیا اور اس کا جواب دینے کے لیے موقعہ پر ہی کھڑے ہوئے تو موقع کی نزاکت اور واقعہ کی شدت کو دیکھتے ہوئے محترم احمد ندیم قاسمی نے انھیں سمجھایا تو جعفری صاحب اس وقت تو اپنا غصہ ضبط کر گئے پر اس ضبط نے انھیں دل کی تکلیف میں مبتلا کر دیا، وہ دل کی تکلیف کے ساتھ ساتھ نظمیں لکھتے رہے۔ اُن کی نظمیں ترقی پسندوں کو بھاتی

رہیں اور وہ لکھتے رہے انھوں نے لکھا،
پھر بہار آئی
پھر آئے مقتلوں میں فاتحہ خانی کے دن
درد کس کا پرفشاں ہے
سرنگوں کس کا علم
آب جو کی سطح خوابیدہ پہ کس باغ جناں کا
پھول ہے
خون میں ڈوبا ہوا
عشق بیچاں کیسا نکلا ہے درون سنگ سے
جو کسی مقراض سے کٹتا نہیں

اس کے بعد، سال نامہ شکستہ ساعتوں کے معمار اور طویل نظم آئینہ خانہ کے وہ معرکتہ آراء بند۔

فقیہہ شہر نے دیکھا ہے روے قاتل میں
جلی زمین کا چہرہ شکستہ شاخ کا زخم

.....

اُسے نہ کھول در بے توجہی کی طرح
گرہ بچی ہے یہی رابطوں کے تاگے میں

.....

رابطوں اور رشتوں کو برقرار رکھنے اور اُن کو نبھانے کا فن اختر حسین جعفری کو خوب آتا تھا۔ جون 1992 میں جب حلقہ ارباب ذوق کے الیکشن کا اعلان ہوا اور دوستوں نے قائم نقوی صاحب کو سیکرٹری اور مجھے جوائنٹ سیکرٹری کے لیے الیکشن لڑنے کا مشورہ دیا، مجھے اور قائم نقوی صاحب کو یقین تھا کہ ہم الیکشن جیت جائیں گے مگر اختر حسین جعفری نے ہمیں مشورہ دیا کہ آپ لوگ فہرست بنائیں اور حلقہ ارباب ذوق کے تمام معزز اراکین سے فرداً فرداً ملاقات کریں اور کچھ نام مجھے بھی دیں جن کو میں کہہ سکوں۔

مئی کے آخری دنوں میں اُن کی طبیعت کی خرابی نے ہمیں مجبور کیا کے ہم الیکشن کو چھوڑ دیں، مگر جعفری صاحب نے سختی سے منع کیا کے اس الیکشن کو انجام تک پہنچائیں۔ پھر انھوں نے لوگوں کو فون بھی کیے، لوگوں سے ملے بھی، اور الیکشن کے سلسلے میں جن دوستوں نے میٹنگ بلائی جعفری صاحب نے اس میں نہ صرف شرکت کی بل کہ مشورے بھی دیئے ۔ اس سارے عرصے میں بہت خوش تھے۔ ہمارے پینل کی بھرپور حوصلہ افزائی کے ساتھ بار بار اصرار کرتے رہے کہ ہمیں محنت کرنی چاہیے مگر الیکشن سے چند دن پہلے 3 جون 1992 کو ہارٹ اٹیک ہوا، اور وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اگرچہ میں اور قائم نقوی صاحب یہ الیکشن جیت گئے، مگر ہماری یہ کامیابی دراصل اختر حسین جعفری کی کامیابی تھی۔ اور شاید یہ ہی وجہ ہے کہ ہم آج بھی حلقہ ارباب ذوق پاک ٹی ہاؤس کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔

اختر حسین جعفری کا مجموعہ نظم
آئینہ خانہ کے نام سے 1981 میں شائع ہوا۔ اسی مجموعے میں ان کی طویل نظم آئینہ خانہ نے اردو ادب کے قارئین کو جدید ترین شاعری سے روشناس کروایا۔ اور یہ سلسلہ تا حال جاری و ساری ہے۔

☆☆☆☆☆

خوش فہمی

حنیف باوا

وہ شہر کے ایک بڑے بینک کا جنرل منیجر تھا۔ جب اس نے ملازمت کا آغاز کیا تب وہ بینک کے کیشئر کی حیثیت سے اپنی مخصوص کرسی پر براجمان تھا۔ ملازمت کے آغاز میں جب وہ بینک کی عمارت میں داخل ہوا تو بینک کی ملازم لڑکیوں کی نظریں اس کے خوبصورت چہرے پر جم کر رہ گئیں تھیں۔ اس کا زیب تن ہوا خوبصورت اور سلیقگی کا مظہر لباس اس کی مردانہ وجاہت میں اضافہ کر رہا تھا۔ چونکہ آج اس کی ملازمت کا پہلا دن تھا اس لیے اپنی حاضری رپورٹ دینے دینے کے لیے سیدھا بینک منیجر کے کمرے میں گیا۔ وہ لڑکیوں کی حسرت بھری نظروں کو درخور اعتنا نہ سمجھتے ہوئے بنا اِدھر اُدھر دیکھے منیجر کے کیبن میں داخل ہو گیا۔ ہاں اس نے پہلے اپنے باس کو اپنی حاضری درج کروائی پھر وہ اپنی سیٹ پر جانے کے بجائے وہیں رکا رہا۔ منیجر کو اپنا مکمل تعارف کرانے کے بعد اس نے دن کا بقیہ حصہ منیجر کے ساتھ گپ شپ میں گزار دیا۔ اس سے اگلے دن اس نے اپنی مخصوص سیٹ سنبھالی اور کام شروع کر دیا۔

اس بینک میں چار لڑکیاں کام کر رہی تھیں، رضیہ، کومل، رفعت اور اذان۔ وہ سب اس کی طرف کھنچی چلی جا رہی تھیں - ان میں رفعت اور کومل تو ہمہ وقت اس سے بات کرنے کی خواہش مند رہتیں - دن میں متعدد بار وہ اس کے قریب جانے کا موقعہ ڈھونڈتی رہتیں اگر رفعت اس کا قرب حاصل کر کے اس سے میٹھی میٹھی باتیں کر رہی ہوتی تو کومل کی خواہش ہوتی کہ رفعت جلد اس کا پیچھا چھوڑے اور وہ اس کی جگہ پر جا بیٹھے اور اس سے اپنے دل کی بات کہہ ڈالے اگر کبھی کومل کو اس سے دبے لفظوں میں اپنے دل کی بات کہنے کا وقت مل جاتا تو اس وقت رفعت کی بھی وہی کیفیت ہوتی جو پہلے کومل کی ہوتی۔ لیکن وجیہہ الحسن کو اپنی خوبصورتی پر بڑا ناز تھا تبھی تو وہ انہیں کبھی خاطر میں نہ لاتا تھا اور نہ ہی ان کی پیار میں ڈوبی ہوئی باتوں کا کوئی اثر لیتا جنہیں وہ دونوں کسی جادو سے کم نہ سمجھتیں۔ رہی رضیہ اور اذان کی بات تو وہ بھی اس پر مرتی ہوئی تھیں لیکن ان کے پاس رفعت اور کومل جتنی کومل ہمت اور حوصلہ نہیں تھا کہ وہ بلا جھجک اس سے گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیتی وہ وجیہہ الحسن کے کیبن میں جانے کی جرأت تو کرتیں لیکن وہاں پہنچ کر لیے دیے رہتیں اور اُس سے اپنے دل کی بات کہنے سے کتراتیں صرف یہی چار لڑکیاں نہیں تھیں جو اس کی کوشش کے دائرے میں مقید تھیں بل کہ راہ چلتی لڑکی بھی اس کی گرویدہ ہونے کی کوشش کرتی، جس کی سر راہ اس سے مڈبھیڑ ہو جاتی۔ اگر کوئی من چلی لڑکی اس کے دفتر آتے جاتے وقت کسی ویگن یا بس میں ہم سفر ہونے کا شرف حاصل کر لیتی تو وہ اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے کی متمنی ہوتی۔ اگر کوئی لڑکی اس سیٹ کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی اور وہ اس کے ساتھ چپکنا چاہتی تو وہ چھوئی موئی کی طرح اپنے آپ میں سمٹ سمٹ جاتا۔

اگر اس کے محلے کی کوئی زینب، رقیہ، یا سمین ہوتی تو ان کے ساتھ بھی وہ منفی رویہ اختیار کرتے ہوئے ان سے ایسی بے اعتنائی برتتا کہ وہ پھر کبھی اس کی طرف بڑھنے کی کوشش نہ کرتی۔

کبھی کبھی وہ شدت سے یہ سوچنے لگتا کہ کیا وہ واقعی اتنا پُرکشش ہے کہ ہر سندر لڑکی اس کے قریب آنے کی کوشش کرتی اس لیے بینک کا وقت ختم ہونے کے بعد جب بھی اسے فرصت ملتی تو وہ گھر کے ڈرائنگ روم

میں لگے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے کشیدہ قامتی اور چھریرے بدن کو غور سے دیکھتا تو اس کا دل اس بات کو تسلیم کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کرتا کہ اس کی اپنی مردانہ وجاہت پر ناز کرنے کا پورا حق ہے۔

آئینے کا یہ سچ اسے مزید مغرور کر دیتا۔

اب وہ خود پسندی کی حدود میں داخل ہونے کے لیے بڑی تیزی سے قدم بڑھا رہا تھا۔
ایک روز اس کے دور کے ماموں کی لڑکی زویہ جو بی اے کی طالبہ تھی اسے گھر میں اکیلا دیکھ کر اپنے سامنے والے گھر سے نکل کر وجیہہ الحسن کے ہاں جا گھسی۔ وہ اس کے پیار میں اس قدر اندھی ہو چکی تھی کہ اس نے جاتے ہی اسے بازو سے پکڑا اور کہنے لگی:

"وجیہہ میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں۔ یہ الگ بات کہ اب تم میں اپنے اس جذبے کا اظہار تمھارے سامنے نہ کر سکی۔ تم مجھے بہت سندر لگتے ہو - اتنے سندر کہ تمھاری صورت میرے دل کے آئینے میں نقش ہو چکی ہے۔"

"تو پھر میں کیا کروں۔"

وجیہہ الحسن کے اس دو ٹوک اور روکھے جواب نے زویا کو بھونچکا سا کر دیا۔ اسی لیے وہ پریشانی کے عالم میں چھوٹے چھوٹے قدموں سے وجیہہ الحسن کے کمرے کو چھوڑ کر اپنے گھر آ گئی۔ اس واقعہ کے بعد نہ تو وجیہہ الحسن زویا کو تنہا ملا اور نہ ہی اس کے بعد زویہ نے اس سے بات کرنے کی جرأت کی۔

دوسری جانب وجیہہ الحسن کے والدین کو اس کی شادی کی فکر کھائے جا رہی تھی اس لیے کہ اب وہ پورے چھبیس برس کا ہو چکا تھا۔
وہ متعدد مرتبہ اس سے اس بات کا ذکر بھی کر چکے تھے لیکن ان کا بیٹا تھا کہ انکار پہ انکار کیے چلا جا رہا تھا۔ وہ کہتا: "ابھی سے شادی کی کیا ضرورت ہے؟ جب وقت آئے گا یہ بھی ہو جائے گی۔"

والدین اس کا یہ انکار سن کر چپ ہو جاتے کیونکہ بیٹے کو زبردستی تو قائل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ کچھ عرصے کے لیے خاموشی ضرور اختیار کر لیتے لیکن انھوں نے اس کی اس ہٹ کے آگے گھٹنے نہیں ٹیکتے رہے وقتاً فوقتاً شادی کے لیے راغب کرنے کی کوشش کرتے۔ آخر کب تک وجیہہ الحسن انکار کرتا رہتا۔ ایک روز ایسا آیا کہ اسے والدین کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے لیکن مشروط طور پر شرط اس کی یہ تھی کہ وہ شادی اپنی پسند کی لڑکی سے کرے گا۔ انھیں اور کیا چاہیے تھا وہ

فوراً مان گئے۔ لیکن اس کی پسند کو تلاش کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ اس کے ماں باپ جس جس لڑکی کے بارے میں بات کرتے یا جو لڑکی اس کی نظروں سے گزرتی اسے یہ کہہ کر رد کر دیتا:

"ابو جی! وہ خوبصورت ضرور ہے لیکن اس کا قد چھوٹا ہے۔"

"امی جان! یہ تو بہت موٹی ہے۔ اس سے میں شادی کیسے کر سکتا ہوں۔"

ابو جی! اس لڑکی کا رنگ تو گندمی ہے مجھے تو گورے رنگ اور لمبے قد اور چھریرے بدن کی لڑکی چاہیے۔ مزید یہ کہ اس کے نین نقش تیکھے اور جاذب نظر ہونے چاہیں۔

امی جی! اس کی تو آواز مردوں جیسی ہے مجھے تو چوڑیوں کی کھنک جیسی آواز والی لڑکی درکار ہے۔"

جب کبھی ان تمام خوبیوں والی مل بھی جاتی تو وہ اسے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیتا۔ وجہ پوچھنے پر بتاتا۔ "نہ جانے کیوں یہ میری نظروں کو نہیں بھائی۔"

آخر وہ وقت آیا جب اس کے والدین کو اس کی پسند کے اعلیٰ معیار کے آگے ہتھیار ڈالنا پڑے اور وہ اس پر خاموش ہو رہے۔ اب انھوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

اب وہ بے فکری سے چہرے پر ہمہ وقت کھیلتی مسکراہٹ کے ساتھ ہر روز بینک جاتا اور آتا رہا۔ لڑکیوں کی نظریں اس کے اندر کچھ ٹٹولتی رہتیں۔ لیکن اس نے تو جیسے اپنے قفل سے بند کر رکھا تھا۔ اس طرح وہ اس کے بطون سے کچھ حاصل کرنے سے قاصر رہتیں۔ جیسے جیسے اس کی عمر کے مہ و سال ماضی کے گڑھے میں گرتے رہے اس کی مردانہ وجاہت اور کشیدہ قامتی میں قدرے جھکاؤ آنے لگا۔ لیکن اسے اس بات کا بہت کم احساس تھا۔ وہ تو خود تو اس بھی عہد شباب ہی میں سمجھتا تھا۔

آج جبکہ وہ کیشئر کی حیثیت سے اسی بینک کی مختلف شاخوں میں اپنی ملازمت کا کچھ عرصہ گزارنے کے بعد پھر اپنی پہلی والی جگہ پر آ گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس آفس میں جو لڑکیاں کام کر رہی تھیں وہ وہاں نہیں تھیں۔ پتا چلا کہ جن کی نظریں تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر بے باکانہ اس کے چہرے کو چومتیں تھیں وہ یا تو وہاں سے تبدیل ہو کر کسی اور جگہ چلی گئی تھیں یا پھر ان کی شادیاں ہو گئی تھیں اور وہ بینک چھوڑ کر اپنے سسرال کی ہو کر رہ گئی تھیں۔ ان کی جگہ جو لڑکیاں آئیں تھیں وہ اس سے التفات کے بہت کم مواقع تلاش کرتیں کیونکہ ان کی نظر میں گزرتے وقت نے اس کی کشش میں کچھ

کمی کر دی تھی۔ وہ صرف اس وقت اس کے پاس جاتیں جب انھیں کوئی دفتری مسئلے کے لیے ضرورت پڑتی یا پھر متعلقہ کسی کام کے بارے میں پوچھ گچھ کرنا ہوتی۔ حالانکہ وہ اب بھی خوبصورتی کی حدود سے اتنا باہر نہیں نکلا تھا جتنا کہ وہ سمجھتی تھیں۔

گزرتے ماہ و سال نے اس کے خدوخال میں جو تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں وہ بھی اس کے باوجود کو بڑھاپے کے حوالے کرنے سے انکاری تھیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ وہ لڑکیاں تو اس میں جوان وجیہہ الحسن تلاش کر رہی تھیں جو انھیں نہیں مل رہا تھا۔

لیکن آج اسے اپنی عمر کے پچاس برس ہاتھ سے نکل جانے کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ بینک میں آتے جاتے وقت ویگن یا بس میں اس کے ساتھ والی خالی سیٹ پر کوئی لڑکی یا تو بیٹھنے سے گریز کرتی۔ اگر کوئی بیٹھ بھی جاتی تو وہ اس سے چپکنے کی ہرگز کوشش نہ کرتی۔ وہ اچٹتی نظر سے اسے ایک بار دیکھتی لیکن پھر اپنا تمام سفر اس سے بے دھیان ہو کر گزار دیتی۔

اب اسے اپنے بوڑھے ہونے کا کچھ شک سا ہونے لگا تھا

جب اس کی عمر کا مزید ایک سال گزر گیا تو اس کا شک کچھ یقین میں بدلتا دکھائی دینے لگا ایک برس اور اس کے جوان ہونے کے احساس کو دھچکا لگا کر ماضی میں ڈوب گیا۔ وہ مزید ڈھلتی عمر کے شکنجے میں آ گیا۔

لیکن گزرتے ہوئے سالوں نے ایک احسان اس پر یہ کیا کہ وہ آج ترقی پا کر اسی بینک میں منیجر کی حیثیت سے اپنی مخصوص کرسی پر براجمان تھا۔ بینک کے دوسرے ملازمین کے علاوہ وہاں پر تعینات لڑکیاں بھی اسے مبارکباد دینے کے لیے اس کے کیبن میں آنے لگیں۔

آج وہ بہت خوش تھا اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے وجود کے گرد خود ساختہ غرور کے حصار میں شگاف پڑنے لگے ہوں۔

آج وہ لڑکیوں سے کھل کر بات کرنا چاہ رہا تھا۔ ان پر اپنی مسکراہٹیں نچھاور کرنے کا خواہش مند تھا لیکن وہ تو وجیہہ الحسن کے اندر اترنے کے لیے نہیں تھیں کہ وہ تو اپنے باس کو رجھانے کے لیے کچھ دیر تک اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرتیں اور پھر اُٹھ کر اپنی اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ جاتیں۔ وجیہہ الحسن کو ان کے خوشامدانہ رویے کو دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی وہ تو چاہتا تھا کہ وہ اس کے قریب آنے کی سعی کرتیں لیکن ایسا نہیں ہوا۔

جب بینک کا وقت اختتام کو پہنچا تو منیجر وجیہہ الحسن مرجھائے دل سے اپنی کرسی چھوڑ

کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ اتنے میں وہ اپنے محلے کی زینے، رقیہ اور سمیع کے بارے میں سوچتا رہا جو اس کی جانب کھینچی چلی جارہی تھیں لیکن وہ تو بیاہی جا چکی تھیں۔ ان کے اپنے گھر تھے، بچے تھے اور وہاں بہت خوش تھیں۔ جب اس کی نئی موٹر سائیکل اس کی رہائش گاہ کی گلی میں داخل ہوئی تو وہ پہلی بار اس کی نگاہیں ان کے گھروں کی جانب اٹھ گئیں جنھیں رقیہ اور سمیعہ اس کی آمد پر اپنے حنائی ہاتھوں سے کھولتیں اور ان کی نظریں اس کی دہلیز تک اس کا پیچھا کرتیں لیکن وہ ہمیشہ انھیں نظر انداز کر کے گزر جاتا تھا لیکن آج جب اس کی نگاہیں ان کھڑکیوں کی جانب اٹھیں تو اس نے دیکھا کہ وہ تو بند تھیں۔

اس نے گاڑی کو یہ سمجھ کر آہستہ کیا کہ شاید وہ کھل جائیں اور ان میں سے رقیہ اور سمیعہ کے بجائے دوسری خوبرو چہرے نظر آجائیں لیکن وہ کھڑکیاں تو ایسی بند تھیں جیسے وہ اس کی آمد پر کبھی نہ کھلی ہوں اور ان میں سے کبھی کسی نے اس کی جانب حسرت بھری نظروں سے نہ دیکھا ہو۔ پھر اس کی نگاہیں اپنے دور کے ماموں کی لڑکی زویا کے مکان کی طرف گھوم گئیں جس نے کھل کر اس سے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا لیکن وہ تو پنجاب یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کرنے کے بعد مقامی کالج میں ہی بطور لیکچرر تعینات ہو چکی تھی۔ اب وہ ایم فل کی تیاری میں اس قدر منہمک تھی کہ اسے وجیہہ الحسن کا کبھی خیال تک نہ آیا تھا۔

جب اس کے چہرے پر مایوسی کے گہرے سائے منڈلانے لگے تو وہ جلدی سے گھر پہنچا موٹر سائیکل کو دالان میں کھڑا کر کے سیدھا ڈرائنگ روم میں لگے قد آدم آئینے کے سامنے چلا گیا جو اس کی انہی سوچوں کو مزید خوبصورت بنانے میں کوشاں رہتا تھا لیکن آج جب اس نے اپنے وجود کا پوری طرح جائزہ لیا اور سر کے بالوں میں آگے سفیدی کی جانب غور سے دیکھا تو اسے ایسا لگا جیسے وہ پچپن برس کا نہیں اسی سال کا بوڑھا ہو چکا ہو۔ اب اسے جوانی کے گزرے ہوئے ان پلوں سے خوف آنے لگا جن میں وہ خود پسندی کے جال میں گھرا ہوا تھا۔

وہ سوچنے لگا: ”کاش میں اس وقت ان ہم عمر حسین اور دل کش لمحوں میں سے کسی ایک کو سنبھال رکھتا جو میری اور امڈے چلے آرہے تھے تو آج میں خود کو اتنا خالی خالی اور تنہا محسوس نہ کرتا۔

کاش.....

☆☆☆☆☆

صفِ ماتم

ثمینہ سعید

گھر میں شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے تھے ایسا لگتا تھا راتیں بھی دن ہو گئی ہیں۔ اکلوتے بیٹے کی شادی کیا طے ہوئی جنید کے والدین تو بولائے بولائے پھرتے تھے کہ کہیں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ شگنوں کے یہ دن کتنے سالوں بعد اس آنگن میں اترے تھے۔

''جنید کے عقیقے پر ایسی رونق لگی تھی جو جیسی اب لگ رہی ہے۔'' دادی نے بہو کو مخاطب کیا اور نظروں ہی نظروں میں جنید کی نظر اتاری تو امی ابا نے بھی گہری مسکراہٹ سجا کے ایک دوسرے کو دیکھا۔ محبت اور سکون کے کتنے ہی پل ان کی آنکھوں کے مہمان بن گئے۔ تیس سال کا ساتھ تھا آخر۔۔۔

اب تو دونوں تھکنے لگے تھے زندگی کی گاڑی چلاتے اور مسائل کی بھٹی میں جلتے ہوئے بھی ایسی تھکن محسوس نہیں کی تھی جیسی جنید کے ملک سے باہر رہنے والے ان پانچ سالوں میں ان کی روح تک اتر آئی تھی۔

اب جب جنید بغیر بتائے ہی واپس آ گیا تو دونوں ہی کھل اٹھے تھے۔

دور نزدیک کے رشتہ دار اپنی جوان بیٹیوں سمیت مبارک دینے آنے لگے تو گھر کا کونہ کونہ بھولی بسری رمزوں پہ مسکرانے لگا۔ جنید نے چچا کی بیٹی کے لیے ہاں کہہ دی وہ شادی کر کے مہینہ بھر سکون سے رہنے کا سوچ رہا تھا۔ اس کی منصوبہ بندی میں امی ابا اور روش کو ساتھ ہی لے کے جانا شامل تھا۔ لیکن وہ ابھی اپنے گھر اور اپنوں میں جینے کا لطف لے رہا تھا جب ایک حادثہ اس کی تقدیر بدلنے آ پہنچا۔

تقدیر بھی کیسی گھنی میسنی چیز ہے جہاں دیکھتی ہے چار بندے خوش ہیں وہیں آن دھمکتی ہے۔ فضا میں کبھی بسنت کے رنگ بکھرتے تھے۔ پکوان پکتے تھے اور لوگ دھنک رنگوں کے لباس پہنے آوازے کستے آپے سے باہر ہوئے پھرتے رہتے تھے۔ لیکن اب ایسا نہیں تھا جنید کو کئی چیزوں نے فرطِ حیرت میں ڈالا۔ بہت کچھ بدل چکا تھا۔ کتنے ہی تہوار اب سہمے رہتے تھے حادثوں نے رونقیں نگل لی تھیں۔ جنید کو اس کے چچا کے بیٹے چھت پر لے گئے تھے بسنت دکھانے کے لیے۔ جنید کی کمائی سے یہ معمولی سا گھر اب حویلی بن گیا تھا چھت تو گویا آسمان سے باتیں کرتی تھی۔

رشتہ دار تو بیٹھے محبتی ہوتے ہی گئے خود جنید بھی بہت خوش تھا اس کے والدین نے اس کی جدائی کے ایک ایک دھاگے سے آسائشیں پروس کے رکھی تھیں کہ ان کا بیٹا آئے گا تو وہ اسے واپس نہیں جانے دیں گے۔ یہیں رکھیں گے اپنے جگر گوشے کو اپنی نظروں کے سامنے اور زندگی کے دامن میں جتنے دن بچے ہیں ان کو خوب اچھی طرح جئیں گے لیکن یہ تقدیر--- کھچڑی بنی ہنستی رہتی ہے اور گھٹنوں میں منہ دبا کے سرگوشی میں کہتی ہے "ہو---- لوخوش ہونی تو وہی ہے جو میں نے کرنی ہے"

ڈیک پہ اونچی آواز میں، پتنگ باز بجا سے--- پتنگ باز بلما سے--- لگا بیچا تو مچ گیا شور--- گانا گونج رہا تھا جب کسی لڑکے نے مست اڑتی پتنگ ایک لمحے کے لیے جنید کے ہاتھ میں دے دی--- پتنگ ڈولنے لگی۔ قہقہے فضا کو مہکا رہے تھے سب جنید کو "انگریج ہو گیا اے" کہہ کہہ کے چھیڑ رہے تھے جب پتنگ نیچے گری تو جنید کے ہاتھ کو کچھ عجیب لگا جیسے کچھ ہوا ہے وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کے دیکھنے لگا---- خون ہی خون تھا۔

"او تیری--- بھاگو بھاگو--- چھپاؤ یہ سب--- جنید تو نے یہ سب پی جانا ہے بھیا۔ کش نہیں ہوا یہاں" وہ دھاڑیں مار کے رو رہا تھا تبھی سب بھاگ گئے شہباز اسے بازو کے حصار میں لیے سہلاتا رہا جیسے ہی وہ سنبھلنے لگا وہ بولا

"جنید بھائی ڈور لینے کسی لڑکے کو بھیجا تھا وہ ایسی ڈور لے آیا، مجھے تو بالکل نہیں پتہ تھا ورنہ میں آپ کے ہاتھ میں کبھی نہ دیتا--- آپ ہمت کریں مرد کہاں روتے ہیں بھائی --- یہ حادثے تو روز کا معمول ہیں۔ یہیں چپ سادھ لیں--- اپنے گھر کی خوشیاں بچائیں۔"

"کس کے خون سے--- میری خوشیاں کیسے بچیں گی۔ مجھے قاتل بنا دیا تم لوگوں نے۔" وہ پوری قوت سے دھاڑا۔ سب اسے پکڑ کر نیچے لے آئے۔ تسلیاں دلاسے اور خوف نے معصوم خوشیوں کی جگہ لے لی۔ یہ جگہ لینا بھی عجیب مشغلہ ہے۔ ذرا اپنی جگہ چھوڑو کوئی دوسرا پاؤں پسار لیتا ہے---- ہونی دھرنا دے چکی تھی اس دہلیز پر۔

سارے لڑکے جنید کو سمجھا رہے تھے "شاید بچ گیا ہو۔ ایسے فوری موت تھوڑی لکھی ہو گی اس کی۔ بھول جائیں--- کچھ ہوا ہی نہیں۔"

شادی کی رات عجیب ملال میں بدل گئی تھی جنید کسی معمول کی طرح دوسروں کے اشاروں پر چل رہا تھا۔ دلہن گھر لے آئے --- اس کی آنکھوں میں سجے سپنے دھڑکے، خدشے بن چکے تھے وہ روش کے قریب بیٹھتا ہوا بولا

"میرا دل اس حادثے کی انی پر اٹکا ہوا ہے پیاری --- ساعتیں کہیں سے رونے والی آوازوں کی بازگشت میں گم ہیں۔ میرا اور تمہارا رشتہ تو اٹل ہے ایسے جیسے میرے سینے میں یہ دل--- لیکن کچھ پتہ چل لینے دو کہ میرے ہاتھوں ہوا کیا ہے؟"

دلہن نے ہاتھ بڑھا کر اس کے سرد ہاتھ

اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ وہ اس کے قریب آ گئی۔

”یہ ہمارے وطن کے لوگ باہر جا کر اتنے حساس کیوں ہو جاتے ہیں جنید۔۔۔ میرے بھائی تو ایسے لوگوں کو بزدل سمجھتے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں کچھ نہیں ہوا ہوگا اور اگر۔۔۔ کچھ ہوا بھی ہے تو ڈور سے گردن کٹنے کے حادثے یہاں روز ہوتے ہیں پھر بھی لوگ رکتے نہیں۔۔ سنبھلتے تک نہیں ہیں۔ ایک گھر میں ماتم ہے تو یہ ماتم برپا کرنے والے شرمندہ تک نہیں ہوتے بلکہ اسی گھر میں۔۔۔ جنازے میں عام لوگوں کی طرح پھرتے رہتے ہیں۔۔۔ جنید یہاں تو انسانیت کا رواج تک نہیں رہا۔ میری ماں کہہ رہی تھی جو ڈر گیا وہ مر گیا سمجھو۔۔۔ لیکن میں۔۔۔۔ میں آپ جیسے انسان کے ساتھ پر بہت خوش ہوں۔۔۔ مطمئن ہوں۔۔۔ شاید کچھ نہ ہوا ہو۔۔۔ شاید۔“

روش کی آواز جنید کی رگوں میں احساس جرم کو سمیٹ رہی تھی وہ قتل کو قتل کہنے کی طاقت رکھتی ہے یہ خوش کن احساس ہوتے ہی جنید اسے دیکھنے لگا۔ وہ اسے شکریہ کہنا چاہتا تھا۔

اسی پل باہر سے آتی آوازوں نے اسے دہلا دیا۔ وہ جھٹ سے باہر نکلا۔۔۔۔ بہت سے لوگ ان کے دروازے پر تھے پولیس بھی تھی اور۔۔۔ کہیں سے ماں کی کرلاتی آواز اس کا دل چیرنے لگی۔ وہ سن رہا تھا

”ڈور لگتے ہی اظہر گر گیا تھا بائیک سے۔۔۔ بچنا مشکل ہی تھا لیکن ہسپتال بروقت لے گئے تو دو تین دن زندگی اور موت کی جنگ چلتی رہی۔۔ ادھر سے ڈور آئی تھی۔ گلی کے کیمرے میں صاف نظر آ رہا ہے۔ تم لوگ شادی رچا کے بیٹھے ہو وہاں صف ماتم بچھی ہے۔“ یہ مختلف لوگوں کی آوازیں زمین و آسمان ہلا رہی تھیں۔

وہ کانپ رہا تھا، رو رہا تھا دلہن کے بھائی اسے پیچھے دھکیلنے لگے۔ تبھی وہ پوری طاقت سے چلایا۔

”جانے انجانے میں جرم کر کے کیسے ہضم کر لیتے ہو تم لوگ۔ کیا ہو گیا ہے میرے وطن کے لوگوں کو۔ بھوک اتنی بڑھ گئی ہے کہ ہم خون پر گزارا کرنے لگے ہیں۔۔۔ مجھے چھوڑو“ وہ اپنے آپ کو اپنے رشتوں سے چھڑوا کر آگے بڑھا

”میں جنید احمد قاتل ہوں۔ میں اعتراف کرتا ہوں تہواروں کو لہو رنگ کرنے والوں میں میں بھی انجانے میں شامل ہو گیا۔ یہ تو شکر ہے کہ مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ میں اس جرم کا اعتراف کر سکتا ہوں۔ قتل تو ہوا ہے بیشک میں نہیں جانتا تھا کہ میرے ہاتھوں میں قاتل ڈور دی گئی ہے۔ میں سزا بھگتوں گا تاکہ تم سب۔۔۔۔ سب میری جدائی کی سزا بھگتو۔۔۔ یہ سمجھ سکو کہ جب کوئی اپنا چلا جاتا ہے تو کیسا لگتا ہے زندگی کیسے بین کرتی ہے۔۔۔“ وہ خود کو گھسیٹتا پولیس کے ساتھ دور سے دور ہوتا جا رہا تھا۔۔۔۔

صف ماتم ایک گھر میں نہیں بچھی تھی۔ بلکہ ہر اس گھر کو اس آگ نے لپیٹ میں لے لیا تھا جو دلہن بنی روش اور جنید کے اپنے تھے۔

☆☆☆☆☆

گھاٹی سے گھاٹ

جب وہ پہاڑوں کے بیچ رنگین موتی نما پتھروں کی تلاش میں گھومتے پھرتے تھک گیا۔ تو دھوپ کی تمازت اور جسمانی تھکن سے اُسے اذیت ہونے لگی۔ تپتے پہاڑوں میں ٹھنڈی اور پرسکون جگہ نہ ملنے کے بعد وہ کچھ فاصلے پر ایک گہری اور تنگ گھاٹی میں اُتر گیا۔ گھاٹی ٹھنڈی اور گہری تھی وہ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اور پھر اُسے نیند آ گئی۔ ٹھنڈک محسوس ہوئی تو اسکی آنکھ کھلی اور اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو اُسے اندازہ ہوا کہ سورج اپنی دھوپ سمیٹتا جا رہا ہے۔ اس نے جلدی سے گھاٹی کے اُس راستے سے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ جہاں سے وہ پھسلتا ہوا نیچے آیا تھا۔ اس نے اوپر چڑھنے کی کوشش کی لیکن پھسل کے نیچے گر پڑتا۔ تین چار بار کوشش کے بعد وہ تھک کر گھاٹی کے اوپر فضا اور پہاڑوں کو دیکھنے لگا تو اُسے خوفناک قسم کا احساس ہوا کہ اوپر جانا اس کے بس کی بات نہیں رہی۔ اس نے یکا یک چیخنا شروع کر دیا۔ پہاڑوں میں اپنی چیخوں کی بازگشت سن کر اُسے قدرے حوصلہ بھی ملتا رہا۔ وہ چیختا رہا بہت دیر کے بعد بڑھتی ہوئی ٹھنڈک، گہری خاموشی اور خوفناک اندھیرے میں اُسے قدموں کی آواز سنائی دی۔ تو اس نے سوکھے ہوئے گلے سے دوبارہ چیخنا شروع کر دیا۔ ہم نے تمہیں ڈھونڈ لیا ڈرو مت۔ اور یہ لو پانی کی بوتل۔ اور پھر صاف تھرے پانی سے بھری ہوئی بوتل بل کھاتی ہوئی اُس کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے پانی پی کر احسان مندی اور عاجزی سے اوپر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا آپ تو میرے لیے کوئی فرشتہ بن کر نازل ہوئے۔ اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ گہری خاموشی کے بعد گھاٹی میں روشنی پھیل گئی۔ تو اُسے اپنے اردگرد خوفناک سانپ رینگتے اور پھنکارتے ہوئے نظر آئے۔ وہ لرزتے ہوئے چیخا۔ میں سانپوں میں پڑا ہوا ہوں۔ گھبراؤ مت اُنہیں نظر انداز کرو۔ روشنی اُنہیں خوفزدہ

کلیم خارجی

رکھے گی۔ پھر رسی کا ایک گولہ اس کے قدموں کے پاس آ کر رُک گیا۔ اس کو اپنی کمر میں باندھ کر اوپر چڑھنا شروع کرو۔ ڈھلوان پر پاؤں رکھتے آؤ اور رسی کو دونوں ہاتھوں سے تھامے رکھو۔

اوپر آتے ہی وہ خوشی اور احسان مندی سے رونے لگا۔ جذبات میں آ کر وہ اپنے بچانے والے کا چہرہ دیکھے بغیر اسکے پاؤں چھوتے ہوئے بولا۔ ان پہاڑوں میں کوئی عام آدمی تو نہیں آ سکتا۔ کسی نے اُسکے کاندھے پکڑتے ہوئے آہستہ سے اُٹھاتے ہوئے کہا۔ اپنے پیروں پہ کھڑے ہو جاؤ اور ہمارے ساتھ چلو گرم چائے اور سموسے سے لطف اُٹھاؤ۔ وہ گہرے اندھیرے میں ٹارچ کی روشنی میں قد آور اور مضبوط آدمیوں کے پیچھے پہاڑوں کے بیچ و خم عبور کرتا ہوا ایک وسیع عریض میدان میں جا پہنچا۔ پہاڑی کی ہموار سطح پر دو ہیلی کاپٹر کھڑے تھے جن کے قریب ہی زمین پر پیلے رنگ کا وسیع قالین بچھا ہوا تھا۔ قالین پہ دسترخوان سجا ہوا تھا۔ اور کھانے پینے کے برتن سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ حیرت سے قدم اُٹھاتا ہوا وہ اجنبی لوگوں کے ساتھ قالین کے قریب پہنچ گیا جانی پہچانی رُعب دار مگر ہمدرد آواز اُبھری جوتے اتار کے قالین پہ بیٹھ جاؤ جو کھانا چاہتے ہو۔ اُٹھا لو اور سیر ہو کر کھاؤ۔ وہ پہچان گیا۔ یہ آواز تو کھائی میں سنائی دی تھی۔ ٹارچوں کی مدد سے روشنی زیادہ ہوئی تو وہ سمجھ گیا۔ کہ وہ اپنے سے زیادہ طاقتور لوگوں کے درمیان ہے۔ وہ کھلتے ہوئے اُس آدمی کے قریب ہو گیا جس نے کھائی کے کنارے پہ کھڑے ہو کر اُسے حوصلہ دیا تھا۔ وہ تو کسی ملک کی سرکاری وردی پہنے ہوئے تھے۔ اگرچہ اس کے کندھے پر کوئی سنہرے تمغے نہیں تھا لیکن اس کے لہجے اور انداز سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کوئی بڑا جنرل ہے۔ کسی نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا، سر اگر اجازت ہو تو باقی بندوں کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے بھیج دیا جائے۔ ہمیں اب حفاظتی دستوں کی ضرورت تو نہیں رہی۔

ہاں بھیج دو اور اس آدمی کو سہولت اور آسانی سے ان پہاڑوں سے نیچے اُتارو۔ ہم تو 400 فٹ کی بلندی پہ ہیں۔ اسے جس طرح کھائی سے نکالا، ویسے ہی کسی ہلکی سی ڈھلوان سے نیچے اُتار دینا اور یہ کھانے پینے کا سامان اُسے ساتھ باندھ دینا۔ وہ محبت اور جذبات سے متاثر ہو کر جنرل کے قریب ہوتے ہوئے بولا، سر جی آپ کی باتیں اور کھانے پینے کی چیزیں ہمارے ہاں کی چیزوں سے مختلف ہیں۔ آپ کے ذائقے مختلف مگر بہت عمدہ سے ہیں۔ اور آپکو دیکھ

کر میرے اعتماد اور خوشی کے جذبات اُبھر رہے ہیں۔ میں نے ساری عمر پتھریلی آنکھیں اور دہشت پھیلاتے ہوئے لوگ دیکھے ہیں۔ جن کے کندھے اور سینوں پر بھاری تمغے سجے ہوتے ہیں اور جن کو ہماری ذہنی اور جسمانی حرکت اور انسانی معیار پر طیش آجاتا ہے۔

جنرل بے نیازی سے مسکراتے ہوئے بولا، میرے بھائی تم ٹھیک سمجھے ہو۔ ہم تمہارے لوگوں میں سے نہیں ہیں۔ ہم پہاڑوں سے دور نچلی وادیوں کے رہنے والے ہیں۔ ہم دن کی روشنی میں تمہاری سرحدوں میں داخل نہیں ہو پاتے۔ کیونکہ تمہارے محافظوں کی انا اور عزت کا معاملہ بہت سنگین ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ طاقتور کہلائے جانے کے شوق میں مبتلا رہتے ہیں۔ اور بغیر کوئی جنگ جیتے فاتح بن کر خراج لینے کے عادی ہوتے ہیں۔ ہم کئی سالوں سے ان پہاڑوں پہ اپنا اختیار حاصل کرنا چاہتے تھے کیونکہ ان میں ہمارے پُرکھوں کے گھر، عبادت خانے اور ان کی بہت سی نشانیاں تھیں۔ جن کو تمہارے لوگوں نے بغیر کسی فتح مندی کے گھمنڈ سے برباد کر دیا ہے ہمارے پرکھوں کی عبادت گاہوں میں تمہارے لوگ لاشیں، اور غلاظتیں پھینکتے رہتے تھے۔ ہم نے ہر طرح سے یہ پہاڑ لینے تھے کیونکہ ان میں ہمارے بزرگوں کی مقدس روحیں آج بھی گھومتی رہتی ہیں۔ ہم پھر سے یہاں اپنا عبادت خانہ تعمیر کروائیں گے۔ اور پہاڑوں کی ڈھلوانوں پہ دیئے روشن رکھیں گے۔ تو کیا آپ نے یہ پہاڑ فتح کر لیے ہیں۔ ہم آپ کے قیدی ہوئے نا۔۔۔ وہ لرزتے ہوئے بولا۔ نہیں۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ جنرل شائستگی سے بولا، تمہارے لوگوں نے ہمیں یہ پہاڑ فتح کرنے کی زحمت ہی نہیں دی۔ اُنہوں نے یہ سارے پہاڑ بیچ دیئے ہیں۔ ہم فتح کرنے کے لیے تیار تھے۔ لیکن تمہارے لوگوں نے بہت کچھ ہمیں قیمتاً دیدیا ہے، جنرل کے لہجے میں ذرا سی تحقیر شامل تھی۔ تمہارے لوگوں کو ان پہاڑوں کی حفاظت کر کے دفاع کرنا اچھا نہیں لگا۔ اُنہوں نے سودا کر لینا مناسب سمجھا۔

اس نے اپنی جیب سے چند رنگین سے پتھر نکال کر جنرل کے سامنے رکھتے ہوئے کہا، سراب ان پہ میرا کوئی حق نہیں رہا یہ آپ کے ہیں۔ جنرل نے مسکراتے ہوئے انگلیوں سے ایک پتھر اُٹھاتے ہوئے اچھی طرح دیکھا اور پوچھا۔ تم ان کا کیا کرتے ہو یہ تو اتنے قیمتی نہیں ہیں۔۔۔؟

جی سر، میں انہیں رگڑ رگڑ کے چمکا دیتا ہوں اور پھر انہیں فروخت کر کے اپنے بچوں کا رزق حاصل کرتا ہوں۔ مجھے اور میرے

بچوں کو بغیر مشقت اور تکلیف کے رزق حاصل نہیں ہوتا۔ ہمارے بڑے لوگ چیزوں کی ایسی قیمتیں مقرر رکھتے ہیں کہ وہ صرف ان کے تصرف میں رہتی ہیں۔ یہ تم رکھ لو اور ان پہاڑوں سے جو کچھ تمہیں مل سکتا ہے تم لے سکتے ہو۔ رزق اگر یہاں سے دستیاب ہوتا ہے تو بہت اچھی بات ہے۔ جنرل نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر تھوڑی دیر بعد خاموش رہنے کے بعد وہ سنجیدگی سے بولا۔ ابھی ایک گھنٹہ پہلے جب میرے اور تمہارے لوگوں کے درمیان معاہدہ پہ دستخط ہو رہے تھے۔ تو تمہاری چیخیں سنائی دینے لگی تھیں۔ میں چونک گیا تھا لیکن تمہارے لوگوں نے میری توجہ ہٹاتے ہوئے کہا تھا۔ کہ تمہارے ہاں کتے، بلے، گیدڑ اور لومڑیاں بھی تکلیف یا جوش میں انسانوں کی طرح آوازیں نکالتے ہیں۔ ہیلی کاپٹروں کا شور شاید تمہیں سنائی نہیں دیا۔ اوپر اس چوٹی میں تمہارے سوداگروں کو رخصت کر کے تمہاری چیخیں دوبارہ سنائی دیں۔ پھر ہم نے تمہیں ڈھونڈنا شروع کیا۔ اور ہم بہت جلد تم تک پہنچ گئے۔

جنرل کے پاؤں دوبارہ چھو کر وہ یوں اُٹھا۔ جیسے بھیک میں زندگی حاصل کر لی ہو۔ جنرل کے ماتحتوں نے خاص قسم کے تھیلوں میں اُسے کھانے کی چیزیں بھر کے اس کندھوں پر لٹکا دیئے۔ اور پھر سپاہیوں کا ایک دستہ اُسے اپنے ساتھ لے کر ڈھلوانوں سے نیچے اُترا۔ پھر انہوں نے دوبارہ اسکی کمر میں رسی باندھی اور اُس نے زمین پہ پاؤں رکھتے ہی چیخ کر ان کا شکریہ ادا کیا۔

زمین پہ پاؤں رکھتے ہی اس نے اپنا سر اُٹھا کر سیاہ اور بلند و بالا پہاڑوں کو دیکھا تو اُس کا دماغ گھوم گیا۔ وہ گرتے گرتے سنبھلا۔ اور اپنی بستی کی طرف جانے لگا۔ بستی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ چند گھروں سے اُٹھتی ہوئی روشنی اس بات کا اعلان رہی تھی۔ کہ ان کے ہاں روشنی کا اپنا خریدا نظام موجود ہے اپریل کے ابتدائی دن رات تھے لیکن رات میں اب بھی ویسی سردی تھی کہ جسم پہ کپکپی طاری ہو جاتی تھی جسم پہ بھاری تھیلوں کے بوجھ سے اس کے لیے چلنا مشکل تھا لیکن ان کو جسم سے چمٹا کر چلتے چلتے اسکی سردی کم ہونے لگی۔ بستی دور تھی لیکن کتوں کے بھونکنے کی آوازیں اُسے کبھی کبھی سنائی دینے لگیں تھیں جب وہ اپنی گلی میں داخل ہوا تو صبح کی اذان ہونے لگی تھی۔ اُس نے اذان کو پہلی مرتبہ اپنے لیے بابرکت سمجھتے ہوئے خود سے وعدہ کر لیا کہ غذا کے تھیلے گھر میں رکھتے ہی وہ آج برسوں بعد مسجد جا کر نماز ادا کرے گا۔ بہت دیر کے

بعد اُس کی سب سے بڑی بیٹی نے دروازہ کھولتے ہی بسم اللہ ---- ابو آپ آگئے شکر ہے کے کلمات ادا کیے۔ بڑے بچے تو سب بھی جاگ گئے تھے۔ بھرے ہوئے تین تھیلے دیکھ کر گھر میں لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اسکی قناعت پسند اور صابر ادھیڑ عمر بیوی نے پہلی مرتبہ اتنی سویرے بجھے چولہے میں آگ جلائی اور جاگنے والے بچوں کو ناشتہ کرایا۔ جوان کے لیے بے حد لذیذ اور حیرت انگیز تحفے سے کم نہ تھا۔ ناشتہ کیے بغیر وہ وضو کرنے جانے لگا تو اسکی بیوی اور جاگنے والی دونوں بیٹیوں اور ایک بیٹے کو بہت حیرت ہوئی۔ ہاں ہاں میں نماز ادا کر کے آؤں گا تو ناشتہ کروں گا اور پھر تمہیں مزے کی کہانی سناؤں گا اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی انجانی قوت اُسے نماز پہ مائل کیے جا رہی ہے۔ وہ خوشی سے دوڑتا ہوا مسجد میں داخل ہوا۔ مسجد میں گنتی کے دس بارہ ہی لوگ تھے اُس نے با جماعت نماز ادا کی اور پھر سجدے میں گر کے زور زور سے روتے ہوئے بولنے لگا۔ اے خدا میں نے آج تک تجھے جتنے سجدے بھی کیے ہیں وہ ان لوگوں کے ڈر سے کیے تھے۔ جنہیں میں تجھ سے زیادہ طاقت ور اور با اختیار سمجھتا رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے وہ سجدے ان لوگوں کو کیے رکھے جن سے میں خوفزدہ رہا۔ پھر میں اُکتا گیا۔ اور میں نے نمازیں چھوڑ دیں تھیں۔ آج برسوں بعد میں دوبارہ سجدے میں گرا ہوں۔ صرف تیرے لیے، صرف تیرے آگے۔ مجھے معاف کر۔ اور میرے سجدے کو قبول فرما۔ پھر وہ دوبارہ رونے لگا۔ امام صاحب اور باقی لوگ اس کے گرد بیٹھ گئے۔ اور اسکے سنبھلنے کا انتظار کرنے لگے۔ اُٹھ کے بیٹھا تو اس نے تمام نمازیوں کو اپنا منتظر پایا۔

کہ کوئی پوچھتا۔ وہ بول پڑا دوستوں ہم سوداگروں کے رحم و کرم پر ہیں۔ وہ سامنے کے بلند و بالا پہاڑ بک چکے ہیں ان کی حفاظت اور دفاع کے بغیر انہیں لوگوں کے پہ بیچ دیا گیا ہے جنہیں مکار اور کمینہ کہہ کر ہمیں اُن کے خلاف لڑنے پر تیار کیا جاتا رہتا ہے تھا۔ میں نے یہ جان لیا ہے پہاڑ بک گئے ہیں۔ تو اور بھی بہت کچھ بک چکا ہوگا۔ دریا، زمین، اور ہم سب بک جانے والے ہیں۔ یا بک چکے ہیں۔ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اور کانوں سے سن کر اس معاملے کا گواہ ہوں۔ ہمارے نئے مالک ہمیں فتح نہیں کریں گے۔ ہمیں خرید لیں گے اور کیا معلوم کہ ہمارا سودا ہو چکا ہوہ ہمارے بیچنے والے ہم سے زیادہ طاقت اور پراسرار اور بھیانک دُنیا جانتے ہیں۔ وہ بھیانک اس لیے رہتے ہیں کہ ہم ان کے

ارادوں سے واقف نہ ہو پائیں۔ وہ طاقتور اس لیے ہیں کہ ہم ان کے کسی عمل میں مداخلت نہ کر سکیں۔

تم بہت دیر تک جاگتے اور محنت مشقت کرتے رہے ہو۔ امام صاحب نے ہمدردی سے کہا بہتر ہوگا کہ تم گھر جاؤ اور دیر تک سوئے رہو اور اُٹھ کر شاید تم بھول جاؤ کہ تم کیا کہتے رہے ہو۔ اور کن لوگوں کے خلاف بولتے رہے ہو۔ میرے بھائی اب کچھ نہ کہنا۔ پھر امام صاحب نے بیٹھتے ہوئے حیران اور خوفزدہ لوگوں سے درخواست کرتے ہوئے کہا۔ کوئی ہے، جو اسے گھر تک سنبھال کے لے جائے۔ نہیں نہیں میں جا سکتا ہوں۔ آج خدا سے بات کر کے اور اُسے سجدہ کر کے دل پر سے بوجھ اُتر گیا ہے۔ مجھے اپنے اندر توانائی سی محسوس ہونے لگی۔ چنانچہ اپنے ساتھ چلنے والوں کو وہ زبردستی روک کے جب اپنی گلی میں داخل ہوا۔ تو اُس کے سر پر ایک بھاری ضرب پڑی۔ اور وہ دھڑام سے گر پڑا۔ درد سے اس کا جسم تڑپ رہا تھا۔ اس کی گردن اُسکے خون سے بھیگ گئی۔ اُس نے منہ کھول کر بات کرنے کی کوشش کی تو اسکے جبڑے کی ہڈی کان تک ٹوٹی ہوئی تھی۔

پھر دوبارہ اُسے اس وقت ہوش آیا۔ جب اُسے زمین پر گھسیٹا جا رہا تھا۔ اُسے احساس ہوا کہ رات کا ٹھنڈا اور گہرا اندھیرا کم ہوتا جا رہا ہے۔ اور اس کے دائیں بائیں بھاری قدم زمین پر نہیں بلکہ اسے اپنے جسم کو کچلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ زمین پہ رگڑ سہتے ہوئے اُسے لگا کہ وہ دوبارہ گہری گھائی میں پھسلتا جا رہا ہے۔ کچرے کے ڈھیر پہ پھینکتے ہوئے ایک آدمی نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا اس کے اوپر کوڑا ڈال دیتے ہیں۔ اُسے اپنے اوپر ٹھنڈی نمی محسوس ہونے لگی تھی ایک آواز اُبھری ہے یار اس بستی کے لوگ بھی بہت کمینے ہیں۔ کوڑے دان اندر سے خالی ہے جب کہ آس پاس غلاظت کے پہاڑ بنے ہوئے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ کوڑے دان کسی فصیل پہ پہرے کی چوکی ہے۔ تم نے اسکی کلائیوں اور پنڈلیوں کی رگیں تو کاٹ دیں ہیں نا۔

ہاں اس کے اندر سے خون تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ دوسری آواز اُبھری ہم نے چند دن پہلے دو لاشیں یہاں پھینکی تھیں اُنہیں بستی کے لوگوں نے دفنا دیا تھا لگتا ہے لوگ اب لاشیں اُٹھا کر دفنانے کے عادی ہو چکے ہیں۔ چلو صبح اس کا دم نکل چکا ہوگا۔ سب کچھ سننے کے بعد اس نے چیخنا چاہا لیکن اس کے منہ پر پڑے ہوئے غلاظت کے ڈھیر میں اُسکی سانسیں ہمیشہ کے لیے دب گئیں۔

☆☆☆☆☆

نقش فریادی ہے

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا رُوبی سفر کی تکان سے آنکھیں بند کیے جیپ کی پچھلی سیٹ پر شاید سو گئی تھی دور حدِ نگاہ تک چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ جنگل کے اِس حصہ میں صنوبر کے درختوں کی کثرت تھی میں نے جیپ کو ایک جگہ روکا رُوبی کے چہرے کو دیکھا اُس کا چہرہ نکھری ہوئی چاندنی میں مجھے اور بھی مدہوش کن لگا۔ دل چاہتا تھا اُس کے قریب بیٹھ کر بس اُسے دیکھتا رہوں اُس کی سانسوں کی آواز سُنتا رہوں۔

گزرے ہوئے واقعات کو ذہن میں مجتمع کرتے ہوئے میں حیران تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ میں نے ایک بار پھر رُوبی کی طرف دیکھا جیسے میں نے اُسے پہلی بار دیکھا ہو۔ روبی اپنی خالہ سے ملنے اِس پہاڑی قصبہ میں آئی تھی جہاں حویلی کے عیاش مکین نے اُسے دیکھا اور اُس کے بدمعاش کارندے اُسے زبردستی اُٹھا کر لے گئے اُس نے اپنے موبائل پر مجھے میسج بھیجا۔ میں قصبہ میں اپنے دوست اکرم کے گھر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اکرم کو یہ واقعہ بتایا تو اُس نے مجھے اور بھی فکر میں مبتلا کر دیا کہ قصبہ کی پولیس تو اُس کی زر خرید غلام کا کردار ادا کرتی ہے تم اوراوپر جا کر رُوبی کو اُس کے دستِ ستم سے آزاد کراس کو اتنی دیر میں جانے اُس پر کیا گزر جائے۔ ہمیں خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ میں نے اپنے غصہ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ رُوبی اپنے موبائل میسج سے صورت حال بتا رہی تھی۔ ہمارے پاس بہت کم وقت تھا رُوبی نے اپنے میسج میں تاکید کی تھی کہ وہ مجھ سے خود رابطہ کرے گی اگر موبائل کی موجودگی کا شائبہ بھی کسی کو ہو گیا تو وہ رابطہ کا ذریعہ بھی کہیں چھین نہ لیں۔ اُس نے لکھا تھا جان مجھے آکر بچالو ورنہ میں جان لے لوں گی۔ حویلی کے مالک نے اپنی عورتوں سے کہا ہے کہ شام تک اِسے بنا سنوار کر میرے پاس بھیجو میں اپنے ایک جھگڑے کو نبٹا کر آتا ہوں۔

اب مجھے انتظار تھا رُوبی کے اگلے میسج کا۔ میں ہر ممکن طریقے سے دوسروں کی نظروں سے بچتا ہوا، اپنی جیپ کو درختوں کے ایک جھرمٹ میں پارک کر کے حویلی کے عقب میں روبی کی بتائی ہوئی جگہ پر بڑی بے چینی سے اُس کا انتظار کر رہا تھا ایک ایک لمحہ ایک

اقبال خان یوسف زئی

برس کا لگ رہا تھا۔ رُوبی نے اپنے آپ کو چھپانے کے لیے حویلی کی ملازم عورتوں جیسی ایک میلی چادر اوڑھ رکھی تھی اُس کے ساتھ حویلی کی کوئی اور عورت بھی تھی۔ میں اُسے اچھی طرح دیکھ نہیں پایا۔ بے چینی اور اضطراب کے ساتھ میں نے روبی کا بازو تھام کر جیپ میں بٹھایا تھوڑا سا دھکا دے کر نشیب والی جگہ سے میں خود بھی جیپ میں بیٹھ گیا انگیشن کچھ دور نشیب کے ختم ہونے پر لگایا تا کہ جیپ کی آواز کوئی سُن نہ سکے۔ شہر کے راستے پر جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ میں نے جنگل کا راستہ اختیار کیا۔ گھنا جنگل تھا جہاں کسی کو ڈھونڈنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ ایک پہاڑی موڑ کاٹتے ہوئے میں نے دیکھا جنگل کی حدود اب 10-15 منٹ کے فاصلے پر تھی۔ جُوں جوں جنگل قریب آرہا تھا میں رُوبی کے چہرے پر ایک اطمینان دیکھ رہا تھا۔

حویلی میں ایک شور بپا تھا نور بخش اپنے کارندوں اور عورتوں پر برس رہا تھا۔ رُوبی کی تلاش کے لیے تین جیپوں پر اُس کے کارندے روانہ کیے جا چکے تھے دو جیپوں کا رُخ شہر جانے والی سڑک کی طرف تھا ایک جیپ کا رُخ جنگل والے راستے پر تھا۔ اونچائی سے ہم یہ سب دیکھ رہے تھے۔ مگر اب ہم اُن کی پہنچ سے کافی دُور نکل آئے تھے اگر جیپ 10-15 منٹ بعد روانہ نہ ہوئی ہوتی تو کچھ عجب نہ تھا کہ شاید وہ ہمیں پکڑ لیتے گو ہم دونوں پر اپنے پکڑے جانے کا خوف اب بھی سوار تھا اور میں اپنی جیپ کو تیز چلا رہا تھا۔ دو دفعہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ اِس جنگل سے گزرا تھا۔ کہ ہم اب دوسری طرف سے اپنے شہر میں پہنچ گئے تو ہم محفوظ ہو جائیں گے، مگر یہ پتھریلی عمارت تو کسی دوسرے ہی راستے کی طرف لی جا رہی تھی۔ جُوں جُوں ہم اُس پتھریلی عمارت کے قریب ہوتے گئے۔ میرا یقین پختہ ہوتا چلا گیا کہ ہم راستہ بھٹک گئے ہیں۔

ایکڑوں میں پھیلی ہوئی اُس عمارت کی طرز تعمیر کو دیکھ کر ہم دونوں پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اس قدر اعلیٰ درجہ کی تعمیر جسے وقت نے گو اپنی پہلی حالت میں رہنے نہ دیا مگر اُس کی باقیات اتنی اعلیٰ کہ اُس کی ٹوٹ پھوٹ اُس کی شکستگی پر میرا ذہن آمادہ نہیں ہوتا اتنی خوبصورت دلکش اور مضبوط جانے وقت کی کتنی کٹھنائیوں سے گزری ہو گی۔ اتنی عظیم تعمیر کی شکست و ریخت پر کتنا وقت لگا ہو گا ذہن قبول کرے تو کیسے اُسے کیسے یقین دلایا جائے کہ قدرت نے مضبوطی کو بھی حُسن کو بھی ہر چیز کے مقدر میں نمو کے ساتھ، تعمیر کے ساتھ ہر ذی روح کے ساتھ فنا لکھ دی ہے صرف فنا۔ میں اُس کے تعمیر کرنے والے کی عظمت کو سراہتا ہوا جانے کب تک اِردگرد سے بے خبر روبی کا بازو پکڑے چلتا رہا اُس نے اپنا بازو چھڑایا تو میں بُری طرح چونکا وہ کہہ رہی تھی۔ جمال! ہم کب تک اِس بھول بھلیوں میں کھوئے رہیں گے کیا گھر نہیں پہنچنا۔ میں نے رُوبی کی طرف دیکھا وہ اب کچھ پریشان نظر آرہی تھی۔ قرب و جوار

میں کوئی ایک متنفس بھی نظر نہیں آتا تھا جس سے راستہ یا اُس جگہ کا نام پوچھا جا سکے۔ اب ہم دونوں کو بھوک بھی لگ رہی تھی وہ تو خیریت گزری کہ ہم شہر کے قصبہ کی طرف آتے ہوئے کچھ کھانا پیک کروا لائے تھے۔ کھانا کھا کر ہم نے تھرموس سے پانی پیا تو تھکاوٹ کا احساس جاتا رہا اور ہم گویا تازہ دم ہو گئے۔ اِک موڑ مڑتے ہی اچانک ایک پہاڑی سلسلہ شروع ہو گیا جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا دھوپ کی شدت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ کئی گھنٹوں کے سفر کے بعد ہم ایک وادی میں داخل ہوئے میں محسوس کر رہا تھا کہ رُوبی کو آواز دی اُس نے ادھ کھلی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور نڈھال سی ہو کر گر گئی اُس کے ہونٹ پیاس سے خشک ہو گئے تھے میں دیکھ رہا تھا اُسے تھوک نگلنے میں بھی مشکل ہو رہی تھی۔ میں نے تھرموس میں بچا پانی اُسے پلا دیا اُس کی جان میں جان آئی۔

میں نے اُس جگہ کا جائزہ لیا دور و نزدیک کہیں پانی مِل جائے روبی کو تسلی دے کر میں ایک جانب چل پڑا اور پھر گویا ایک معجزہ ہو گیا دُور جاتے ایک شخص پر میری نظر پڑی میں اُس کی جانب آوازیں دیتا ہوا بڑھا۔ وہ رُکا پھر مڑ کر میری جانب تیزی سے بڑھنے لگا۔ سفر کی حالت میں یہ پہلا آدمی تھا جو نظر آیا تھا اُس کا ملنا میرے لیے کسی اچنبھے سے کم نہ تھا اُس نے مجھے دیکھ کر تعجب کا اظہار کیا میں نے اپنے راستہ بھٹک جانے کا مذکرہ کیا اور کہیں سے پانی مِل جائے تو میرے حواس قابو میں آ جائیں گے۔ راستہ کا پوچھا تو اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے ایک خشک سے چشمہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا میں نے اپنے بزرگوں سے سُنا ہے یہ چشمہ آبِ حیات کہلاتا ہے گو اب یہ خشک ہو گیا ہے مگر کبھی کبھی اِس میں سے بوند بوند پانی ٹپکتا ہے اُس کا مذاق اڑاتا ہوں وہ کہتا ہے میری سچائی کا کیا یہ ثبوت نہیں کہ آج بوند بوند پانی ٹپک رہا ہے پیاس کی شدت سے میرے ہاتھ کانپ رہے تھے میں نے تھرموس کے گلاس میں بوند بوند پانی کو بڑی دیر لگا کر جمع کیا پھر ایک ہی سانس میں پی گیا۔ میرا جسم پیاس سے گویا مرجھایا ہوا تھا اتنے پانی کا مِلنا بھی معجزہ سے کم نہ تھا۔ چشمہ آبِ حیات کے ہونے کو میں نے کوئی اہمیت نہ دی اُس آدمی "کبیر" کو میں جاتے دیکھتا رہا اُس کا مِلنا میرے لیے جہانِ حیرت تھا۔

وہاں سے واپس جا کر میں نے روبی کو واقعہ بتایا اُس کا حیران حیران چہرہ سوالیہ نشان بنا رہا میں نے اُس آدمی جس نے اپنا نام کبیر بتایا تھا ملنے کا بھی ذکر کیا رُوبی کہنے لگی۔ جمال قدرت کا اپنا انتظام اور نظام ہے وہ تو ایسے اسباب پیدا کر دیتا ہے کہ نا اُمیدی میں اُمید کے پھول کھل جائیں زندگی سے پیار کرنے کو جی چاہنے لگے۔ موسم میں کافی خنکی ہوا میں تیزی آ گئی تھی جلد ہی ہمیں پہاڑی چشمے کے

قریب ایک غار مل گیا۔ ہم دونوں جیپ سمیت اندر چلے گئے۔ دور کہیں بجلی کا کوندا بارش ہونے کے قوی امکان کو ظاہر کر رہا تھا اور پھر اس زور کی بارش ہوئی کہ جل تھل ہو گیا بجلی کا کڑکا اور موسلا دھار بارش نے آگے جانے کے خیال تک کو دھو دیا۔

رُوبی نے میرے ساتھ مل کر مجھ سے چھٹ کر سفر کیا تھا مگر اس وقت ہم اِس خوف سے خاموش رہے تھے کہ تعاقب کرنے والوں تک ہماری گفتگو نہ پہنچے اور یہ ایک ایسی بھیانک غلطی ہوتا جس کو ہم کبھی معاف نہ کر پاتے مگر غار میں پہلی دفعہ ہم اس فکر سے آزاد ہوئے۔ اب میرے سامنے بیٹھی ہوئی رُوبی مطمئن نظر آئی دل چاہتا تھا دنیا جہان کی باتیں ایک ہی سانس میں کر ڈالیں اور یہ گفتگو ہی تو ہے جو ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے آدمی اپنے سُکھ کا اپنے دُکھ کا اظہار کرتا ہے اپنا، اپنا لگتا ہے اور جب کوئی اپنا ساتھی اپنا رفیق ہو تو جانے کہاں سے اتنے لفظ آ جاتے ہیں ہماری ازدواجی زندگی کے یہ ابتدائی ماہ تھے کہ یہ المناک حادثہ ہوا۔ روبی کہنے لگی جمال۔ میں تمہارے بغیر کیسے جیتی میں نے دل میں ٹھان لیا تھا کہ جیتے جی تو کوئی مجھے چھو نہ پائے گا۔ میں نے کہا روبی مجھے اپنے انتخاب پر فخر ہے تمہاری دل و جان سے حفاظت اور تم سے محبت بس یہی میری زندگی ہے۔ بادلوں کے پرے آسمان کی وسعتوں میں تیر رہے تھے اب مزید غار میں ٹھہرنا وقت کو ضائع کر دینے کے مترادف تھا۔ ایک اونچے درخت پر چڑھ کر میں نے اردگرد دیکھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اگر میں جنوب کی طرف چلوں تو منزل تک پہنچ سکتا ہوں۔ ایک نشانی میرے ذہن میں تھی خوش قسمتی سے میں اُس سے کچھ دور نہ تھا میں نے روبی سے کہا زندگی شاید ہم پر بہت مہربان ہے۔ اُمید ہے کہ ہم جلد ہی اپنے شہر پہنچ جائیں گے۔

ہم اپنے گھر پہنچ گئے جہاں ہم ایک نئی زندگی کی ابتدا کرنا چاہتے تھے ایک نئے ارادے ایک نئی اُمنگ کے ساتھ، مگر نور بخش کا نام۔ بارود کی طرح میرے ذہن میں بھرا ہوا تھا میرے دل میں غصے اور انتقام نے ایک آگ سی بھر دی تھی دل چاہتا تھا ریوالور کی سب گولیاں اُس کے سینے میں اُتار دوں۔ روبی کو میری ذہنی حالت کا اندازہ ہو گیا تھا کہ اُس نے کہا۔ جمال معاف کر دینا۔ انسان کے حوصلے کو بڑھاتا ہے۔ اُسی شام اکرم کا فون آیا وہ کہہ رہا تھا میں نے تمہیں بہت فون کیے۔ میں نے اُسے بتایا موبائل بیٹری ختم ہو گئی تھی پھر اکرم نے بتایا کہ نُور بخش کو جس عورت پر شک تھا کہ اُس نے تمہاری بیوی کو بھگانے میں اُس کی مدد کی ہے اس نے اُسے بری طرح پیٹا کہ وہ بے ہوش ہو گئی اُس کے خاوند کو پتہ چلا تو غصے سے کھولتے ہوئے اُس نے نُور بخش کا خاتمہ کر دیا۔

قصبہ کے لوگ نور بخش کا اگر ظلم ماننے میں آگے تھے تو اُس کی نفرت انگیز ہلاکت پر

حویلی کی ستم رسیدہ عورتوں کے ساتھ پورا قصبہ خوشی منانے میں بھی پیچھے نہیں رہا۔ اکرم نے یہ بھی بتایا وہ عورت جس نے تمھاری بیوی کی مدد کی اُس کا نام کمو ہے اور وہ ضربات کی وجہ سے ہسپتال میں زیرِ علاج ہے۔

رُوبی کو میں نے پوری روداد سنائی تو اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ کمو پر جو گزری ہو گی میں محسوس کر سکتی ہوں۔ وہ جانتی تھی کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے مگر اُس نے میرے لیے میری عزت کی حفاظت کے لیے وہ کام کیا۔ میں زندگی بھر اُس کا یہ احسان بھلا نہ پاؤں گی۔ یہ زندگی ہے جمال۔ اِس نے کہیں اِک روز ختم بھی ہونا ہے آدمی مر جاتا ہے بھوک سے حادثے سے بیماری سے اپنے پیاروں سے جُدا ہو جاتا ہے یا کسی مقصد کسی آرزو کی تکمیل کرتے ہوئے اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے مگر اُن کے جانے کا غم زندگی کے ساتھ چلتا ہے۔ میں نے کہا میری فلاسفر بیوی تم ایسی باتیں بھی جانتی ہو مجھے اُس پر جانے کیوں پیار آ رہا تھا کہ میں اُسے دیکھتا رہوں اُس کی باتیں سنتا رہوں گزرے ہوئے کل کی باتیں یاد آ رہی ہیں مگر رُوبی تم کہاں ہو؟

لو پھر دینے لگیں سوز بجھتی یادیں
دل کے داغوں پہ چراغاں کا گماں ہوتا ہے

.....

بچپن کا ایک منظر میرے ذہن کے پردے پر اُبھرتا ہے میرے والد دیوار سے اپنا سر مارتے ہوئے رو رہے ہیں اپنے باپ کے مرجانے پر، پھر میں ایک صبح سویا پڑا ہوا ہوں کوئی مجھے جھنجھوڑ کر اُٹھا رہا ہے کہ تیرا باپ مر گیا ہے۔

میں بہت سے چہروں کو یاد کرتا ہوں باپ کے مرنے کا دکھ کیا ہوتا ہے آنے والا وقت اُس کی اہمیت کو بتاتا ہے میں اپنے چچا کو یاد کرتا ہوں جس میں ایک دھتکار ہے حقارت ہے قدم قدم پر نفرت کا اظہار ہے مجھ سے کوئی تعلق کیا رشتہ سے بھی انکاری اور پھر ایک دن اُس رشتے کی اپنی نبضیں ڈوب جاتی ہیں۔ اُس کی آواز کی کرختگی، نفرت وقت کے ہاتھوں پسپا ہو جاتی ہے۔ ایک اور منظر ایک اور رابطہ ایک اور رشتہ جو کسی اور ملک چلا گیا ہے اپنی دودھ شریک بہن عالم گیر کی آواز سنتا ہوں وہ مجھ سے اپنے بھائی سے فون پر بات پر بات کرتے ہوئے رو رہی ہے اتنا دُور جانے پر اُس کی محبت پگھلتی ہوئی محبت میرے کانوں میں اُس کے لہجے کی مٹھاس اُس کا گداز۔ یاسیت میری روح کی گہرائیوں میں اُترتی ہوئی۔ اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اُڑتی ہوئی میرے پاس آ جائے۔ محبت سے پیار سے اپنے بازوؤں کے حلقے میں مجھے سمیٹ لے۔ پھر ایک دن مجھے اُس کے مرنے کی اِطلاع ملتی ہے میں دل میں کہتا ہوں کہ لو تم بھی گئیں ساتھ میرے کھیلنے والی "قالم سے گئی عالم" ایک اور رشتہ ایک اور بہن مجھے یاد آ رہی ہے تمھارے ساتھ میں اپنی تایا زاد بہن کے ساتھ جاتا ہوں اُس کا خیر مقدم کرنے کا خوبصورت انداز، اُس کا سحر آفریں جملہ "دو

ہنسوں کا جوڑا آ گیا" اُن لفظوں کی لطافت اُن کی حلاوت اُن الفاظ کی مہک۔ وہ نگاہیں جن میں زمانے بھر کی محبت پنہاں تھی میرے دل کے نہاں خانے میں کیوں بسی رہتی ہے وہ بھی، نہ چاہتے ہوئے بھی سُوئے عدم ہری ہری دوب پہ چلتا ہوا میں جامن کے پیڑ کے نیچے پہنچا اُس بینچ پر بیٹھ گیا جہاں ہم دونوں فرصت کے لمحات گزرتے تھے۔ تم وہاں نہیں تھیں۔ پائیں باغ کے اُس کونے تک گیا جہاں ہم پنجوں کے بل کھڑے ہو کر ایک دوسرے کا بازو تھامے سڑک کا نظارہ کرتے تھے تم وہاں بھی نہ تھیں۔ تم گھر کے کسی حصے میں نہ تھیں ۔ تم دنیا کے کسی کونے قریے میں نہیں ہو تو کہاں ہو زوبی کہاں ہو۔ میں سوتے ہوئے۔ تمھارے سانسوں کی آواز سنتا ہوں مگر میرا پہلو تو سُونا پڑا ہے۔ روبی تم تو زندگی کی سب سے قیمت متاع تھی تمھارے ہنسنے سے دھنک کے سارے رنگ بن جاتے تھے تمھاری آواز سے ستاروں کی لو جگمگاتی تھی۔ زندگی کو نئے سرے سے بتانے کی آرزو جاگتی تھی۔ تم جو میرے لیے دن کے اُجالے سے زیادہ خوبصورت تھی۔ میری نظروں کے سامنے بہت سے منظر ہیں میرے گھر دلہن بن کر آنے کا منظر کبھی بھولتا ہی نہیں تم کیا گئی زندگی کا سارا سکون بھی تمھارے ساتھ رخصت ہو گیا۔

ایک لق ودق صحرا ہے میں پاپیادہ نہ کوئی جادہ نہ کوئی منزل چلا جا رہا ہوں۔ حدِ نگاہ کہیں کوئی نہیں ایک سناٹا بھی تو ماحول کی تنہائی کا نام ہے اور میرے ساتھ میرا اپنا کوئی نہیں کہیں بھی نہیں۔ اکیلا تنہا زندگی کا بوجھ اُٹھاتے اُٹھاتے تھک گیا ہوں جہاں بھی جس طرف بھی جاتا ہوں تنہائی کا احساس دل میں کچوکے لگاتا ہے۔ میں زندگی سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں خدایا کیا کروں۔ کیا کروں مجبوراً جس آبِ حیات کو تمسخر اُڑاتے ہوئے پیا تھا تو کیا خدا کے بنائے ہوئے نظام سے بغاوت نہ تھی۔ خدا تُو تو جانتا ہے کوئی عزیز رشتہ دار کوئی دوست باقی ہیں۔ زندگی تو مصروف رہنے کا نام ہے۔ کسی اپنے کے ساتھ صبح و شام بسر کرنے کا نام ہے۔ یہ کیا عذاب ہے جو خود میں نے اپنے پر مسلط کیا۔ یہ کیسی بے چینی ہے۔ یہ کیسی بے کلی ہے۔ یہ کیسی بے بسی ہے یوں زندگی کیسے گزرے گی۔ کیونکر گزرے گی مجھے زندگی نہیں چاہیے الٰہی رحم فرما دے۔ پھر میں اپنے چھوٹے بیٹے کے سلام کی آواز سنتا ہوں کمرے سے باہر میرے پوتے، پوتیوں کی آوازیں میرے کانوں میں آ رہی ہیں۔ آوازیں زندگی کی تمام تر لطافتوں سے لبریز چمکتی ہوئی مہکتی ہوئی آوازیں۔ مگر کیا یہ سب آوازیں سراب کی مانند ہیں جو سنائی تو دیتی ہیں مگر ان کا وجود کیا کہیں نہیں کیا کہیں بھی نہیں۔ میں چونک کر سوچتا ہوں۔ "میں موت کو دیکھ رہا ہوں۔ میں اُسے بُلاتا ہوں۔ وہ تمسخرانہ انداز میں مجھ سے کہتی ہے۔" میں خوش قسمت لوگوں کے پاس آتی ہوں۔

☆☆☆☆☆

زندہ درگور (بقیہ حصہ)

مجھے یاد ہے، تین دن پہلے، میں اس کمرے میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک، پاگلوں کی طرح چہل قدمی کر رہا تھا۔ دیوار پہ لٹکے ہوئے کپڑے، واش بیسن، الماری میں لگا ہوا شیشہ، دیوار پہ لگی ہوئی تصویر، بستر، کمرے کے درمیان میں میز اور اس پہ بکھری ہوئی کتب، کرسیاں، جوتے جو کہ الماری کے نیچے چلے گئے تھے، کونے میں پڑے ہوئے بکس، ایک ایک کر کے میری آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ لیکن میں اُن کو دیکھ نہیں پایا یا میں نے خود ہی اُن کو نہیں دیکھا۔ میں کیا سوچ رہا تھا؟ مجھے نہیں معلوم۔ میں صرف چہل قدمی کر رہا تھا۔ اچانک، میں اپنے پاس آیا۔ میں نے ایسی بے چین چہل قدمی پہلے بھی کہیں دیکھی تھی اور یہ خیال مجھے میرے پاس کھینچ لایا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کہاں۔ پھر میں نے یاد کیا۔۔۔ شاید برلن کے چڑیا گھر میں۔ پہلی بار میں نے جنگلی جانوروں کو دیکھا تھا۔ وہ جو جاگ رہے تھے، وہ اپنے پنجروں میں اسی طرح بے چینی کے ساتھ، آگے پیچھے چل رہے تھے۔ اُس وقت بھی، میں اُن جانوروں کی طرح بن گیا تھا۔ شاید، میں اُن کی طرح سوچ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ میں بھی اُن کی طرح تھا۔ یہ اضطرابی چہل قدمی، میرے اردگرد گھوم رہی تھی۔ جب میں دیوار کی جانب آیا، میں نے جبلی طور پہ محسوس کیا کہ وہاں راستے میں کوئی رکاوٹ تھی اور میں واپس پلٹ آیا۔ وہ جانور صرف یہی کچھ کر رہے تھے۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں کیا لکھ رہا ہوں؟ ٹک ٹک ۔۔۔ گھڑی کی آواز مسلسل ایک مخصوص شور کے ساتھ میری ساعتوں سے ٹکرا رہی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اسے اُٹھاؤں اور کھڑکی سے باہر پھینک دوں۔ یہ خوفناک آواز جو گزرتے ہوئے وقت کا احساس دلاتی ہے اور کسی ہتھوڑے کی طرح میرے سر سے ٹکراتی ہے!

ایک ہفتے سے، میں خود کو موت کے لیے تیار کر رہا تھا۔ میرے پاس جو کچھ بھی لکھا ہوا اور کاغذ

صادق ہدایت (ایران)
مترجم: حمزہ حسن شیخ

تھے، میں نے وہ سارے پھاڑ دیئے۔ میں نے اپنے گندے کپڑے پھینک دیئے تاکہ جب میں چلا جاؤں اور لوگ میری چیزوں کا معائنہ کریں، اُن کو کوئی چیز گلی سڑی نہ ملے۔ میں نے نئی چادریں بھی بستر پر ڈال دیں جو میں خرید لایا تھا تاکہ جب لوگ مجھے اس بستر سے نکالیں اور ڈاکٹر آ کر میرا معائنہ کریں تو میری دکھائی دینے والی حالت ہو۔ میں نے عطر کی بوتل اُٹھائی اور پورے بستر پر چھڑکا تاکہ اس سے خوشگوار مہک آ سکے۔ لیکن کچھ نہ ہوتے بھی، میں نے بھی دوسرے لوگوں کی طرح کیا، مجھے ابھی بھی خود پہ یقین نہیں تھا۔ میں اپنے بھدے پن سے خوف زدہ تھا۔ ایسے محسوس ہوا جیسے یہ حق اور معتبری کسی اور کو آسانی سے نہیں دی گئی تھی۔ میں نے جانا کہ تم صرف اپنی خواہش پہ کبھی بھی نہیں مر سکتے۔

میں نے اپنے رشتہ داروں کی تصاویر نکالیں اور اُن کو دیکھا۔ میں نے ہر ایک کا تصور کیا جیسے میں نے اُن کو دیکھا ہو۔ میں نے اُن کو پسند کیا اور شاید میں نے اُن کو کبھی بھی پسند نہیں کیا۔ میں اُن کو ملنا چاہتا تھا یا شاید نہیں۔ نہیں، اُس جگہ کی یادیں میری آنکھوں کے سامنے بہت روشن ہیں۔ میں نے وہ ساری تصاویر پھاڑ دیں۔ نہیں، مجھے کوئی بھی لگاؤ نہیں تھا۔ میں نے خود کو جانچا اور دیکھا کہ میں کوئی پیار کرنے والا شخص نہ تھا۔ مجھے مشکل، ناگوار اور خستہ حال بنا دیا گیا۔ شاید مجھے اس طرح نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یقینی طور پہ مجھے، زندگی اور قسمت نے ایسا بنا دیا تھا۔ اور مجھے موت سے ذرہ بھر بھی خوف نہ تھا۔ اس کے برعکس، کوئی انوکھی بیماری یا پاگل پن مجھ میں آ گیا تھا جو مجھے دھیرے دھیرے اور متناطیسی انداز میں موت کی جانب کھینچ رہے تھے۔ اس میں کوئی بھی نیا پن نہیں تھا۔ مجھے صرف ایک کہانی یاد تھی۔ یہ پانچ سال پہلے کی بات تھی۔ ایک دن، تہران میں، صبح سویرے میں ایک منشیات فروش کے پاس تھوڑی سی افیم خریدنے کے لیے شاہ آباد ایونیو کی جانب گیا۔ میں نے تین تومان کا نوٹ اُس کے کاؤنٹر پر رکھا اور اُس سے دو قران مالیت کی افیم کا پُوچھا۔ منشیات فروش نے اپنی مہندی رنگی داڑھی اور سندارہ کے ساتھ، حمد و ثنا کرتے ہوئے، شکوک بھری نظروں سے مجھے گھورا جیسے وہ چہرے اور دماغ پڑھنے میں ماہر ہو۔ اس نے کہا، ''میرے پاس کرنسی کا بھان نہیں ہے؟'' میں نے دو قران کے نوٹ نکال کر اُس کو دیئے۔ اُس نے کہا، ''نہیں، میں یہ تم کو نہیں بیچوں گا۔'' میں نے پُوچھا کہ کیوں اور اُس نے جواب دیا، ''تم بہت نوجوان اور معصوم ہو۔ اللہ معاف کرے، کسی دن تم یہ افیم کھا کر اپنی زندگی ختم کر بیٹھو گے۔'' اور میں نے بھی اصرار نہیں کیا۔

نہیں، خودکشی کوئی چیز نہیں ہے جو آپ کرنے کا فیصلہ کرو۔ یہ خواہش صرف چند لوگوں میں ہوتی ہے۔ یہ اُن کے مزاج اور طبیعت کا حصہ ہوتی ہے۔ اور ہاں، ہر کسی کی قسمت اُس کی پیشانی پر لکھی ہوتی ہے اور کسی کسی کے ساتھ یہ پیدا

ہوتی ہے۔ میں نے زندگی کو کبھی بھی سنجیدہ نہیں لیا تھا۔ دنیا اور یہ لوگ مجھے ہمیشہ ایک بیوقوفانہ کھیل، ایک بے عزتی، خالی پن اور بے مقصد معاملہ دکھائی دیتا ہے۔ میں سونا چاہتا ہوں اور دوبارہ کبھی بھی نہیں اُٹھنا چاہتا اور نہ ہی کوئی خواب دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن جیسا کہ سارے سوچتے ہیں، خودکشی ایک عجیب و غریب عمل ہے، میں خود کو دائمی طور پر بیمار کرنا چاہتا ہوں اور جب میں بالکل نااہل اور قریب المرگ ہوتا ہوں اور ہر کسی کو اس کے بارے میں معلوم ہوتا ہے: میں افیم کھالوں گا اور وہ کہیں گے: ''وہ بیمار ہوا اور مر گیا۔''

میں بستر پر لیٹے ہوئے نوٹس بنا رہا ہوں۔ سہ پہر کے تین بج رہے ہیں۔ دو لوگ مجھے ملنے کے لیے آئے۔ اب وہ چلے گئے ہیں اور میں بالکل اکیلا ہوں۔ میرا سر چکرا رہا ہے۔ میرا جسم بالکل آرامدہ اور پُرسکون ہے۔ میرے پیٹ میں، چائے کا ایک بھرا ہوا پیالہ ہے۔ میرا جسم کمزور اور بیماری کی غیر صحت مند گرمی سے تھکا ہوا ہے۔ میں نے گراموفون پر ایک خوبصورت دھن سُنی۔ یہ صرف مجھے محسوس ہوئی۔ میں اس کو سیٹی میں گنگنانا چاہتا ہوں لیکن نہیں کر پاتا۔ میں خواہش کرتا ہوں کہ میں دوبارہ اس کو سُن پاؤں۔ اس لمحے، نہ ہی مجھے زندگی سے محبت محسوس ہوتی ہے اور نہ ہی نفرت۔ میں نا چاہنے کے باوجود بھی زندہ ہوں، زندہ رہنے میں بغیر کسی دلچسپی کے۔ کچھ غیر معمولی طاقت نے مجھے زندہ رکھا ہوا ہے۔ زندگی کی اس قید میں، میں لوہے کی زنجیروں سے جکڑا ہوا ہوں۔ اگر میں مر گیا، وہ مجھے پیرس کی مسجد میں لے جائیں گے اور مجھے بے دین عربوں کے حوالے کر دیں گے اور مجھے دو بار مرنا پڑے گا! میں تو اُن کو دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔

تاہم، اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مرنے کے بعد، چاہے وہ مجھے کسی بیت الخلا میں بھی پھینک دیں۔ یہ میرے لیے بالکل ایک عام سی بات تھی۔ کم از کم آخر کار مجھے سکون مل جائے گا۔ صرف گھر میں، وہ رونا پیٹنا اور ماتم شروع کر دیں گے اور پھر وہ میری تصاویر باہر نکالیں گے اور ساری باتیں یاد کریں گے جو کچھ بھی اُن کو میرے بارے میں یاد ہوگا۔ وہ وہی بیوقوفانہ حرکتیں کریں گے جو وہ ہمیشہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ ساری باتیں مجھے بے مقصد اور احمق دکھائی دیتی ہیں۔ میں یہ خیال کرتا ہوں کہ کچھ لوگ مجھے بہت ہی بہترین انسان پیش کریں گے جبکہ کچھ میرے بارے میں خرافات بھی کہیں گے۔ لیکن آخر میں، مجھے بھلا دیا جائے گا۔ میں ہمیشہ ہی بہت خود غرض اور تنہائی پسند انسان تھا۔

میں خیال کے جس بھی سرے کو پکڑتا ہوں، جو بھی اس زندگی سے جڑا ہوا ہے، وہ مجھے بے مقصد دکھائی دیتا ہے۔ میں معاشرے کے لیے آکاش بیل بن چکا ہوں، ایک ناقابل برداشت وجود، دوسرے لوگوں کے لیے ایک اضافی بوجھ۔ وقتاً فوقتاً میرا پاگل

پن مجھے بے چین کرتا ہے۔ میں دور جانا چاہتا ہوں، بہت ہی دور، کسی ایسی جگہ جہاں میں خود کو بھلا سکوں یا بُھلا دیا جاؤں، نکال دیا جاؤں یا غائب کر دیا جاؤں۔ میں خود سے فرار ہونا چاہتا ہوں، بہت ہی دور، شاید سائبریا، دیودار کے درختوں کے نیچے اُن لکڑی کے گھروں میں، اُس سرمئی آسمان، برف، بہت ہی گہری اور موٹی برف، اُن روسی کسانوں کے درمیان، وہاں جاؤں اور ایک بار پھر سے میں اپنی زندگی شروع کروں؛ یا شاید میں ہندوستان چلا جاؤں، جلتے ہوئے سورج کے نیچے، اُلجھے ہوئے درختوں سے اٹے ہوئے جنگلوں میں، اُن عجیب وغریب اور انوکھے لوگوں کے درمیان، کہیں بھی چلا جاؤں جہاں مجھے کوئی بھی نہ جانتا ہو اور نہ ہی کوئی میری زبان سمجھتا ہو۔ میں اپنے اندر کی ہر چیز کو محسوس کرتا ہوں۔ لیکن میں دیکھ سکتا ہوں، مجھے اس کام کے لیے نہیں بنایا گیا تھا۔ نہیں، میں سست اور بے پرواہ ہوں۔ میں شاید غلطی سے پیدا ہوا ہوں۔ میں نے ہر کام کرنے کی کوشش کی ہے اور ناکام رہا ہوں۔ میں ایک ناپسندیدہ شخص ہوں اور میں پھنس چکا ہوں۔ میں نے سارے منصوبے چھوڑ دیے ہیں، جو میں نے محبت اور خوشی کے لیے بنائے تھے؛ میں نے ہر چیز سے کنارہ کشی کر لی تھی۔ اس لیے مجھے پہلے سے مردہ شدہ لوگوں میں ہی شمار کیا جائے۔

کبھی کبھار میں بڑے بڑے منصوبے بناتا ہوں۔ میں خود کو کسی بھی کام کے لیے مکمل قابل سمجھتا ہوں۔ میں خود کو کہتا ہوں: ”صرف وہی لوگ زندگی میں بڑے بڑے کارنامے انجام دے پاتے ہیں جن کا زندگی اور ہر چیز سے دل بھر چکا ہو۔“ پھر میں خود کو کہتا ہوں، ”اس کی کیا ضرورت ہے؟ یہ کونسا اچھا کام کرے گی؟ پاگل پن، یہ سب پاگل پن ہے۔ نہیں، صرف خود کو مار دو۔ اپنی لاش وہاں درمیان میں گرنے دو۔ چلتے رہو۔ تمہیں زندگی کے لیے نہیں بنایا گیا۔ یہ فلسفہ چھوڑ دو۔ تمہارا وجود کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا ہے۔ تم کہیں بھی کام کرنے کے قابل نہیں ہو۔“ لیکن مجھے نہیں معلوم کہ موت نے اپنی ناک مجھ سے کیوں موڑ لی ہے۔ یہ مجھے کیوں نہیں آتی؟ میں اسے پانے میں کیوں ناکام ہوں اور وہ سکون پانے میں ناکام ہوں جو مجھے چاہیے؟ میں ایک ہفتے سے، خود کو بہت اذیت دے رہا ہوں۔ اور اس طرح مجھے اس کی قیمت کیسے ادا کرنی پڑی۔ زہر مجھ پر کچھ اثر نہیں کرتی۔ یہ بہت ہی ناقابل یقین بات ہے۔ میں اس پر یقین نہیں کر سکتا۔ میں نے کچھ بھی نہیں کھایا ہے۔ میں نے خود کو ٹھنڈ کے حوالے کیا۔ میں نے سرکہ بھی پیا۔ ہر رات میں نے سوچا کہ مجھے سرپٹ دوڑتی ہوئی کھپت نے پکڑ لیا تھا۔ جب میں صبح اُٹھا، میں نے خود کو پہلے والے دن سے بہتر محسوس

کیا۔ میں یہ سب کس کو بتا سکتا ہوں؟ ایک بار بھی مجھے بخار کی حرارت محسوس نہ ہوئی۔ لیکن میں نے کوئی خواب بھی نہ دیکھا۔ مجھے یہ سب اچھی طرح یاد ہے۔ نہیں، یہ سب ناقابل یقین ہے۔

اب میں نے یہ ساری چیزیں لکھ لی ہیں، مجھے اپنا آپ خالی خالی سا محسوس ہو رہا ہے۔ اس نے مجھے تسلی دی ہے۔ یہ اتنا ہی سخت ہے جیسے کہ ایک بھاری بوجھ میرے کندھوں سے اُتر گیا ہو۔ کتنا ہی اچھا محسوس ہوا گر کوئی سب کچھ ہی لکھ لے۔ اگر میں اپنے خیالات کسی دوسرے تک پہنچا سکوں، یا میں اُن سے کہہ سکوں۔۔۔ نہیں، وہاں پہ جذبات ہیں، چیزیں ہیں، جو میرے لیے کسی دوسرے شخص کو بیان کرنا ناممکن ہیں، جو کبھی بھی نہیں کہا جا سکتیں۔ وہ تم پر ہنسیں گے۔ ہر بندہ اپنے خیالات کے مطابق دوسرے لوگوں کو جانچتا ہے۔ ایک بندے کی زبان، خود اس کی طرح گنگ اور کمزور ہو جاتی ہے۔

میں ناقابل شکست ہوں۔ زہر کا مجھ پہ کوئی اثر نہیں ہوتا۔ میں نے افیم کھائی اور یہ بھی کوئی اچھی ثابت نہیں ہوئی۔ ہاں، میں لوہے کے جسم کا بن چکا ہوں۔ کوئی بھی زہر مجھ پر دوبارہ اثر نہیں کرے گی۔ دراصل، میں نے جانچ لیا تھا کہ ساری تکلیف جو میں نے اُٹھائی تھی، وہ کسی بھی چیز کے لیے نہیں تھی۔ پچھلی رات، میں نے اپنا ذہن بنا لیا کہ میں اس ناکامی کو انجام تک پہنچاؤں، اس سے پہلے کہ یہ خبر ہر جگہ پھیل جائے۔ میں گیا اور افیم کے کیپسول، بستر کے ساتھ رکھی میز کی دراز میں سے باہر نکالے۔ وہ تین عدد تھے، تقریباً اتنی ہی تعداد میں، جتنا کہ افیم کا ایک رول ہوتا ہے۔ میں نے اُن کو اُٹھایا۔ یہ سات بجے کا وقت تھا۔ میں چائے پینے کے لیے چلا گیا۔ جب وہ چائے لے آئے تو میں نے پی لی۔ آٹھ بجے، کوئی بھی مجھے ملنے کے لیے نہیں آیا۔ میں نے اندر سے دروازہ بند کر دیا۔ میں گیا اور دیوار پہ لگی تصویر کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اُسے دیکھنے لگا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرے ذہن میں کیا خیالات گزر رہے تھے، لیکن یہ تصویر مجھے کسی اجنبی کی دکھائی دیتی تھی۔ میں نے خود سے کہا، ''اس آدمی کا مجھ سے کیا لینا دینا ہے؟'' لیکن میں چہرہ پہچان گیا تھا۔ میں نے اُسے کئی بار دیکھا تھا۔ پھر میں دوسری جانب مُڑا۔ مجھے گھبراہٹ، خوف یا خوشی کے کوئی احساسات نہ تھے۔ جو کچھ بھی میں نے کیا تھا یا جو کچھ بھی میں کرنے جا رہا تھا۔ مجھے وہ سب کچھ بے مقصد اور بے کار محسوس ہوا۔ میری ساری زندگی مجھے ناکام لگی۔ میں نے کمرے میں نظر دوڑائی۔ ہر چیز اپنی جگہ پہ موجود تھی۔ میں الماری میں لگے شیشے تک آیا اور اپنے سرخ چہرے پہ نظر دوڑائی۔ میں نے اپنی آنکھیں آدھی بند کر لیں، اپنے منہ کو ذرا سا کھولا اور اپنے سر کو ایک جانب لڑھکا دیا جیسا کہ میں مر چکا ہوں۔ تب میں نے خود کو کہا، ''کل صبح، مجھے اسی طرح دکھائی دینا ہے۔ پہلے پہل،

تاہم، وہ دروازے پر دستک دیں گے لیکن کوئی بھی جواب نہیں دے گا۔ دوپہر تک، وہ سوچتے رہیں گے کہ میں سویا ہوا ہوں۔ پھر وہ کمرے کا تالا توڑیں گے، کمرے میں داخل ہوں گے اور مجھے اسی طرح پائیں گے۔" یہ سارے خیالات بجلی کی طرح میری آنکھوں کے سامنے کوندے۔

میں نے پانی کا ایک گلاس اُٹھایا۔ بہت آہستگی سے، میں نے خود کو کہا: "یہ اسپرین کی گولیاں ہیں۔" اور میں نے پہلا کیپسول نگل لیا۔ پھر، مدہوشی کی عالم میں، میں نے یکے بعد دیگرے دوسری اور تیسری گولی بھی نگل لی۔ میں نے خود کو ذرا سا کانپتے ہوئے محسوس کیا۔ میری سانس سے افیم کی بُو آنے لگی۔ میرے دل کی دھڑکن بہت ہی زیادہ تیز ہوگئی۔ میں نے ادھ جلا سگریٹ ایش ٹرے میں پھینک دیا۔ میں گیا اور اپنی جیب سے سانس صاف کرنے والی گولی نکالی اور اس کو چوس لیا اور خود کو دوبارہ شیشے میں دیکھا۔ میں نے دوبارہ کمرے میں نظر دوڑائی۔ ہر چیز اپنی جگہ پہ موجود تھی۔ میں نے خود کو کہا: "اچھا، یہ تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ کل مجھے افلاطون بھی زندگی کی جانب واپس نہیں لے آپائے گا۔" میں نے بستر کے ساتھ، کرسی پر اپنے کپڑے شائستگی کے ساتھ رکھ دیئے اور اپنے اُوپر چادر تان لی۔ میں نے غسل خانے والی تیز اب پی لی۔ میں نے بتی بجھائی اور کمرہ تاریکی میں ڈوب گیا۔

پیچھے دیوار پر اور بستر کے پایوں میں، کھڑکی سے آنے والی کمزور سی روشنی پڑ رہی تھی۔ کچھ بھی کرنے کے لیے نہیں تھا۔ اچھے یا بُرے کے لیے، میں اس حد تک گیا تھا۔ میں سو گیا۔ میں نے کروٹیں بدلیں۔ جو کچھ بھی میں سوچ سکا: "خدا کے لیے، کسی کو بھی مجھے دیکھنے کے لیے نہ آنے دیں کہ میں کیسا ہوں اور اُن کے لیے پریشانی کا باعث ہوں۔" اگرچہ میں نے سب کو بتایا تھا کہ کچھ راتوں سے، میں سونے کے قابل نہیں تھا۔ تاکہ وہ مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔ اب میں خوفناک حد تک متجسس تھا اگرچہ کچھ پُرلطف ہوا تھا جیسے کہ میں ایک خوشگوار سفر کی تیاری باندھ رہا تھا۔ میں واقعی موت کے تجربے کا مزہ لینا چاہتا تھا۔ میں نے متوجہ ہونے کی کوشش کی لیکن میرے کان مسلسل کمرے سے باہر آنے والے شور کو سُن رہے تھے۔ جب کبھی بھی مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی تو میرا دل ڈوبنے لگتا۔ میں نے اپنی پلکیں زور سے بھینچ لیں۔ دس منٹ گزرے یا کچھ زیادہ، اور کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں نے خود کو مختلف خیالات کے ساتھ مجتمع کرلیا لیکن نہ ہی میں نے افسوس کیا کہ میں نے کیا کیا تھا اور نہ ہی میں خوفزدہ تھا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ افیم نے اپنا کام شروع کردیا تھا۔ پہلے پہل مجھے بھاری پن محسوس ہوا، پھر مجھے تھکاوٹ کے احساسات ہوئے۔ یہ احساس زیادہ تر میرے معدے میں ہو رہا

تھا، جیسے کہ کسی کی خوراک اچھی طرح سے ہضم نہ ہوئی ہو۔ اس کے بعد، یہ تھکاوٹ میرے سینے تک سرایت کر گئی اور پھر میرے سر تک۔ میں نے اپنے ہاتھوں کو حرکت دی، اپنی آنکھیں کھولیں اور دیکھا کہ میں اچھی طرح ذہنی طور پر چست تھا۔ مجھے پیاس محسوس ہوئی۔ میرا منہ خشک ہو چکا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے تھوک نگلا۔ میرا دل زیادہ آہستگی سے دھڑک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد، میں نے اپنے جسم سے گرم اور خوشگوار بخارات کو پھوٹتے ہوئے محسوس کیا۔ زیادہ تر میرے ناک کی نوک اور میری انگلیوں کی پوروں سے۔ بیک وقت، میں سمجھ گیا کہ میں خود کو مارنا چاہتا ہوں۔ میں نے یاد کیا کہ کچھ لوگوں کے لیے یہ بہت ہی ناخوشگوار بات تھی۔

میں خود سے واقعی ششدر ہو چکا تھا۔ یہ ساری چیزیں مجھے بچگانہ، غیر اہم اور مزاحیہ دکھائی دیں۔ میں نے سوچا کہ اب مجھے آرام کی ضرورت تھی اور میں اسی احساس کے ساتھ مرنے جا رہا تھا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ دوسرے لوگ پریشان ہیں یا نہیں، وہ روئیں گے یا نہیں؟ میں یہ کچھ ہونے کا شدید خواہش مند تھا، اور میں حرکت کرنے یا سوچنے سے خوفزدہ تھا، کم از کم، مجھے ایم کے عمل کو بند کرنا چاہیے۔ سب سے زیادہ جو میں خوفزدہ تھا کہ (کیا یہ ممکن تھا؟)۔ اس ساری تکلیف کے بعد، مجھے زندہ رہنا پڑے گا۔ میں خوفزدہ تھا کہ موت بہت تکلیف دہ ہو سکتی تھی اور کہ مایوسی میں، مجھے چلانا یا مدد کے لیے پکارنا چاہیے۔ لیکن پھر میں نے کہا: "تاہم، یہ دردناک تو ہو گی، ایم آپ کو موت میں دھکیل دیتی ہے اور مجھے ایسی کوئی چیز محسوس نہیں ہوئی۔ میں صرف ایک نیند سے دوسری کی جانب جاؤں گا، اور میں نہ ہی کوئی حرکت کر سکتا ہوں اور نہ ہی کچھ کہہ سکتا ہوں اور دروازہ تو ویسے بھی اندر کی جانب سے بند ہے!"

ہاں، مجھے یہ اچھی طرح یاد ہے۔ یہ وہ خیالات ہیں جو میرے دماغ میں آتے ہیں۔ مجھے گھڑی کا یک اسلوب شور سنائی دیا۔ مجھے ہوٹل میں گھومتے ہوئے لوگوں کے قدموں کا شور سنائی دیا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا کہ میری قوت سماعت تیز ہو گئی ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرا جسم اُٹھ رہا ہے۔ میرا منہ خشک ہو چکا تھا۔ میرے سر میں تھوڑا سا درد تھا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا کہ میں کومے جیسی کسی کیفیت میں تھا۔ میری آنکھیں ادھ کھلی ہوئی تھیں۔ کبھی کبھار میرا سانس تیز اور دوبارہ آہستہ ہو جاتا۔ میرے جسم کے سارے پوروں سے، یہ خوشگوار گرمی رس رہی تھی۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے میں اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ میں اس کی شدت کو بہت زیادہ بڑھانا چاہتا تھا۔ میں ایک ناقابل بیان بے خودی میں ڈوب گیا تھا۔ میں نے کسی چیز کے بارے میں سوچا جو میں کرنا چاہتا تھا۔ اگر میں روٹی کا ٹکڑا کھاتا، مجھے محسوس ہوا کہ وہ اس گرمی کے پسینے کو رُوک دے گا۔ جتنے زیادہ آرام سے میں سوؤں، وہی بہتر ہے۔

میں نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے نیچے سے نکالا، اپنے جسم پہ پھیرا اور پیٹھ کے بل سو گیا۔ میں ذرا سا بے آرام تھا اور میں نے اپنی کروٹ اسی طرف کر لی جس جانب پہلے تھی۔ افیم کا اثر بڑھ گیا۔ میں نے اسے محسوس کیا کہ میں مرنے کے اس تجربے سے بہت کچھ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میرے احساسات بہت زیادہ تیز اور اُونچے ہو گئے۔ میں ششدر تھا کہ میں ابھی تک سویا نہیں تھا۔ یہ اتنا ہی مشکل تھا کہ میرا پورا وجود خوشگواری اور آرام کے ساتھ میرے جسم سے جدا ہو رہا تھا۔ میرا دل آہستہ آہستہ دھڑکتا ہے۔ میں نے آہستہ سے سانس لیا۔ میرے خیال میں، دو یا تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ اس وقت کے دوران، کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے جانچ لیا کہ یہ میرا ہمسایہ تھا لیکن میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں ذرا سا بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں کھول کر اُن کو دوبارہ بند کیا۔ میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سُنی۔ اُس نے اپنے ہاتھ دھوئے اور خود ہی سیٹیاں بجانے لگا۔ میں نے سب کچھ سُنا۔ میں نے خوشگوار اور آرامدہ خیالات سوچنے کی کوشش کی۔

میں نے ایک سال پہلے کے بارے میں سوچا۔ وہ دن، جب میں ایک کشتی میں بیٹھ رہا تھا۔ وہ منہ سے ایک باجا بجا رہے تھے۔ سمندر کی لہریں، جہاز کی شگفتہ حرکت، میرے مقابل بیٹھی ہوئی خوبصورت لڑکی --- میں اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے اُن کا تعاقب کیا جیسا کہ میرے پر ہوں اور میں خلا میں اُڑ رہا تھا۔ میں اس طرح بالکل ہلکا اور پُھرتیلا ہو چکا تھا جس کو بیان کرنا ناممکن تھا۔ اس میں فرق ایسے ہی ہے جب آپ روشنی کی ایک کرن کو قدرتی طور پر دیکھتے ہیں اور جب آپ افیم کے زیرِ اثر ہوں تو آپ کو ایسی روشنی ایسے دکھائی دیتی ہے جیسے یہ کسی موم بتی کے پیچھے سے آتی ہے یا کسی شیشے کے منشور سے: یہ مختلف رنگوں سے منقش ہوتی ہے۔ اس حالت میں جو سادہ اور خالی خیالات کسی کو آتے ہیں، وہ لاجواب اور جادوائی رُوپ دھار لیتے ہیں۔ ہر آنے والا بیوقوفانہ خیال مسحور کن اور پُرتعیش بن جاتا ہے۔ اگر کوئی منظر یا نظارہ آپ کے خیالات میں آجاتا ہے، یہ بے حد بڑا بن جاتا ہے۔ خلا پھول جاتا ہے۔ وقت کی گزران ان دیکھی بن جاتی ہے۔

اس وقت تک، میں بہت بھاری ہو چکا تھا۔ میرے حواس لہروں کی طرح میرے جسم کے اُوپر سے گزرے لیکن میں جاگتے ہوئے ہوشیار تھا۔ آخری احساسات، جو افیم کے خواب کے بعد مجھے یاد ہیں، وہ یہ تھے: میری ٹانگیں ٹھنڈی اور بے حس ہو چکی تھیں، میرا جسم بے حرکت تھا، میں نے محسوس کیا کہ میں دُور، فاصلے پہ ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن جیسے جیسے اس اثر کا خاتمہ ہوا، ایک ناختم ہونے والے دُکھ اور افسوس نے مجھے آلیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے حواس واپس صحیح ہو رہے

تھے۔ یہ بہت ہی مشکل اور دردناک تھا۔ مجھے ٹھنڈ محسوس ہوئی۔ ایک گھنٹے سے بھی زیادہ کے بعد، میں نے بُری طرح کانپنا شروع کر دیا۔ میں اپنے دانت بجنے کا شور سن سکتا تھا۔ پھر مجھے بخار ہو گیا۔۔۔ ایک جلا دینے والا بخار جس نے میرے پورے جسم کو پسینے سے شرابور کر دیا۔ میرے دل کی دھڑکن بند ہو گئی۔ میں سانس نہیں لے سکتا تھا۔ پہلا خیال جو مجھے آیا، وہ یہ تھا کہ جو کچھ بھی میں نے کیا تھا، وہ سب کچھ برباد، بے مقصد ہو گیا تھا اور یہ سب کچھ ذرا سا بھی کارگر ثابت نہیں ہوا تھا جو میں چاہتا تھا۔ میں اپنی قسمت پہ، کچھ زیادہ ہی حیرت زدہ رہ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ کوئی سیاہ رو طاقت، کچھ ناقابل بیان بدقسمتی میرے خلاف برسرپیکار تھی۔

بمشکل، میں اپنے بستر پر بیٹھ گیا، سوئچ آن کیا اور پھر بجلی آ گئی۔ کسی چیز کے لیے، میرا ہاتھ سیدھا، بستر کے ساتھ رکھی میز کے چھوٹے شیشے کی جانب گیا۔ میرا چہرہ پھول چکا تھا۔ میرا کوئی رنگ نہ تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو جھلکنے لگے۔ مجھے بہت زیادہ مایوسی محسوس ہوئی۔ میں نے خود کو بتایا کہ کم از کم میں نے اپنے دل کو تباہ کر لیا تھا! میں نے بتی بجھائی اور دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔

نہیں، میں نے اپنا دل تباہ نہیں کیا تھا۔ آج، یہ اچھا تھا۔ یہ اس دنیا کی صرف مکمل اور صحت مند چیزیں تھیں جن کو ہمیشہ بیماری یا طاعون برداشت کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر میرے معائنے کے لیے آیا۔ اُس نے میرا دل چیک کیا، میری نبض کا معائنہ کیا، میرا درجہ حرارت لیا اور باقی تمام معمول کی چیزیں جو کہ عام طور پہ ڈاکٹر کرتے ہیں۔ وہ ساری دنیا میں ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اُس نے مجھے پھل، نمکیات اور کنین دی۔ اُسے بھی معلوم نہ تھا کہ میرے ساتھ کیا مسئلہ تھا۔ یہ کسی کی دسترس میں نہ تھا کہ میرے ساتھ کیا مسئلہ تھا۔ یہ دوا میرے لیے مضحکہ خیز تھی۔ وہاں میز پر سات یا آٹھ قسم کی دواؤں کی شیشیاں ایک قطار میں دھری تھیں۔ میں خود پہ ہنسا۔ یہ کیسا ڈرامہ تھا!

ٹک ٹاک۔ گھڑی میرے کانوں میں، اپنے مخصوص پُرانے شور کے ساتھ چلتی رہی۔ کھڑکی کے باہر سے، گاڑیوں کے ہارنوں کی آوازیں اور موٹر سائیکلوں کا شور آ رہا تھا۔ میں نے دیوار پہ لگے اوراق دیکھے۔ اس پر باریک، گہرے ارغوانی پتے اور سفید پھولوں کے گچھے ہیں۔ شاخوں پر باقاعدہ کچھ فاصلے پر، دو سیاہ پرندے ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہیں۔ مجھے اپنا سر خالی محسوس ہوتا ہے، میرا معدہ گڑگڑ کرتا ہے اور میرا جسم سخت ہے۔ میں نے الماری پر جو اخبارات پھینکے تھے، وہ ایک انوکھے انداز میں گرنے لگے۔ جب میں نے اُن کو دیکھا، یہ ایسے ہی اچانک تھا جیسے کہ وہ مکمل طور پر عجیب دکھائی دیتے ہوں۔ میں خود کو اجنبی محسوس ہوا۔ میں حیران ہوں کہ میں ابھی تک زندہ ہوں۔ میں کیوں

سانس لیتا ہوں؟ مجھے بھوک کیوں لگتی ہے؟ میں کیوں کھاتا ہوں؟ میں کیوں چلتا ہوں؟ میں یہاں کیوں ہوں؟ یہ کون لوگ ہیں جو میں دیکھتا ہوں اور وہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟

اب میں خود کو اچھی طرح سے جانتا ہوں، بالکل ایسے ہی جیسے میں کسی بگاڑ میں ہوں۔ میں کچھ بھی کرنے سے قاصر ہوں۔ میں تھکا ہارا اور خستہ حال اپنے بستر پر پلٹ آیا ہوں۔ ساعت بہ ساعت، میرے خیالات مایوسی کے ایک جیسے چکروں میں گھومتے ہیں، گھومتے ہیں۔ میں تھک چکا ہوں۔ میرا وجود مجھے سکون دیتا ہے۔ اپنے وجود کو محسوس کرنا کتنا ہی ناخوشگوار اور غیر مہذب ہوتا ہے! جب میں شیشے میں دیکھتا ہوں، مجھے خود پہ ہنسی آتی ہے۔ میرا اپنا چہرہ میرے لیے اجنبی ہو چکا ہے--- بہت ہی عجیب و غریب اور مضحکہ خیز---

کئی بار مجھے یہ خیال آیا ہے: میں کانسی کے جسم کا بن چکا ہوں، پرانے ہیرو اسفندیار کے کانسی جیسے جسم کی طرح--- اس کی کہانی میری بن چکی تھی۔ یہ ایک معجزہ تھا۔ اب میں ہر قسم کی بکواسیات اور توہم پرستی پر یقین کرتا ہوں۔ بہت ہی سحر انگیز خیالات میرے سر میں سے گزرتے ہیں۔ یہ ایک معجزہ تھا! اب مجھے معلوم ہے کہ خدا، نے اپنی کچھ حقارتوں، ناانصافی اور جبر کے ساتھ، دُنیا میں دو قسم کی مخلوقات بنائی ہیں؛ خوش قسمت اور بدقسمت۔ وہ پہلی قسم کی دیکھ بھال کرتا ہے اور دوسری قسم پر اپنا ظلم اور تشدد زیادہ کر دیتا ہے۔ اب میں یقین کرتا ہوں کہ کچھ لوگ کے ساتھ، حقیر وحشی طاقت اور کچھ بدقسمتی کے فرشتے رہتے ہیں۔

اب میں ایک بار پھر اکیلا ہوں۔ ڈاکٹر ابھی ابھی گیا ہے۔ میں نے اپنا قلم اور صفحہ اُٹھایا ہے اور میں لکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ کیا۔ یا میرے پاس لکھنے کے لیے کچھ نہیں ہے یا میرے پاس بہت کچھ ہے جو میں لکھ نہیں سکتا۔ یہ خود ہی ایک بدقسمتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم۔ میں چیخ نہیں سکتا۔ شاید اگر میں چیخوں، میں شاید خود کو اچھا محسوس کروں لیکن میں نہیں کر سکتا۔ میں ایک پاگل آدمی کی طرح دکھائی دیتا ہوں۔ شیشے میں، مجھے اپنے سارے بال اُلجھے اُلجھے نظر آتے ہیں، میری آنکھیں خالی اور کشادہ کھلی ہوئی ہیں۔ میں نے سوچا، "میرا چہرہ کبھی بھی اس طرح نہیں ہونا چاہیے۔"

بہت سے لوگوں میں، اُن کے چہرے اور اُن کے خیالات کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔ یہ مجھے کچھ زیادہ اذیت پہنچاتا ہے۔ جو کچھ بھی میں جانتا ہوں کہ میں خود سے نفرت کرتا ہوں۔ میں کھاتا ہوں اور خود سے نفرت کرتا ہوں۔ میں چلتا ہوں اور خود سے نفرت کرتا ہوں۔ میں سوچتا ہوں اور خود سے نفرت کرتا ہوں۔ یہ مجھے کبھی بھی تنہا نہیں چھوڑے گا۔ یہ مجھے کوئی سکون نہیں دے گا! نہیں، یہ کوئی ماورائی قوت تھی۔ یہ کوئی طاعون تھا۔ اب میں ان چیزوں پر یقین کرتا ہوں۔ کسی چیز کا بھی مجھ پہ زیادہ اثر نہیں تھا۔ میں نے سائینائڈ نگل لی۔ کچھ بھی نہ

ہوا۔ میں نے افیم لی اور ابھی تک زندہ ہوں۔ اگر کوئی اژدھا مجھ سے ٹکرائے، تو اژدھا مر جائے گا۔ نہیں، کوئی بھی اس پہ یقین نہیں کرے گا۔ کیا زہر بے اثر ہو چکی تھی؟ شاید میں صحیح مقدار میں نہیں لے سکا؟ کیا یہ معمول کی خوارک سے زیادہ تھی؟ کیا میں نے طب کی کتاب میں اس کی مقدار کو غلط پڑھا تھا؟ کیا میرے اپنے ہاتھ نے اس زہر کو بے ضرر بنانے میں عمل انجام دیا تھا؟ مجھے نہیں معلوم۔ سینکڑوں بار، یہ خیالات میرے دماغ میں آ چکے ہیں۔ ان میں کچھ بھی نیا نہیں ہے۔ میں نے سُنا کہ اگر وہ آگ کا ایک دائرہ کسی بچھو کے اردگرد رکھیں، یہ خود کو کاٹتا ہے۔ کیا میرے اردگرد بھی کوئی آگ کا دائرہ نہیں ہے؟ میرے کمرے کی کھڑکی کے مخالف، سیاہ کنیٹے دار چھت کے کنارے پر، جہاں بارش کا پانی ایک کھوکھل میں جمع ہوتا ہے، وہاں دو چڑیاں بیٹھی ہیں۔ ایک اپنی چونچ پانی میں ڈبوتی ہے، اپنا سر اُوپر اُٹھاتی ہے اور دوسری، اس کے قریب ٹھونگے مارتی ہے، اپنے آپ کو پھیلاتی ہے۔ میں حرکت کرتا ہوں، دونوں چہچہاتی ہیں اور اُڑ جاتی ہیں۔ آسمان ابر آلود ہے۔ کبھی کبھار ایک پیلا سورج، بادلوں کے ٹکڑوں کی اُوٹ سے جھانکتا ہے۔ مقابل کی اُونچی اُونچی عمارتیں، دھویں سے سیاہ زدہ، اور ہوا کے برساتی اور بھاری دباؤ تلے ماتم کناں ہیں۔ بہت دُور، شہر کے گدلے شور کو سُنا جا سکتا ہے۔

یہ فال کے سڑے ہوئے کارڈ، جو میری قسمت بتاتے ہیں، ان نیچے پڑے ہوئے کارڈوں نے مجھے دھوکہ دیا ہے، اور وہاں وہ دراز میں پڑے ہیں۔ سب سے مزاحیہ بات یہ ہے کہ میں ابھی بھی اپنی قسمت ان سے بتا سکتا ہوں!

میں کیا کر سکتا ہوں؟ قسمت مجھ سے زیادہ مضبوط ہے۔

یہ اچھا ہو گا اگر تم اپنے سارے تجربے کے ساتھ، دوبارہ واپس اس دنیا میں آ سکو، جو تم نے اپنی پہلی زندگی سے حاصل کئے ہیں، اور اس کو دوبارہ سے شروع کرتے ہیں۔ لیکن کیا زندگی؟ کیا یہ مجھ پہ منحصر ہے؟ اس کی کیا ضرورت ہے؟ کچھ اندھی اور خوفناک قوتیں میرے سر پر سوار ہو جاتی ہیں۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں جن کی قسمت ایک بدستارے کے زیر تسلط ہوتی ہے جو وہ کچل دیتے ہیں اور یا وہ کچلے جانے کے خواہاں ہوتے ہیں۔

نہ ہی میری کوئی خواہش ہے اور نہ ہی کوئی حسرت کہ میں اپنا آپ دوبارہ حاصل کروں۔ جو کوئی بھی انسان میرے اندر تھا، میں نے کھو دیا ہے، میں نے اُسے خود ہی کھونے دیا۔ زندگی میں، ایک انسان کو فرشتہ، انسان یا جانور ہونا چاہیے۔ میں ان میں سے کچھ بھی نہیں بن سکا۔ میری زندگی ہمیشہ کے لیے کھو گئی ہے۔ میں خود غرض، مغرور، بے بس اور بھدا پیدا ہوا تھا اور اب یہ میرے لیے بالکل ناممکن ہے کہ میں واپس مڑوں اور ایک نئی سڑک پر زندگی

شروع کروں۔ یہ اب میرے لیے بالکل بھی ناممکن نہیں کہ ان بے کار سایوں کے پیچھے بھاگوں یا زندگی کے ساتھ دوبارہ آنکھ ڈال کر اس کے ساتھ کشتی کروں۔ تم جو یہ سوچتے ہو کہ تم واقعی زندہ ہو، آپ کے پاس دینے کے لیے مضبوط اور منطقی ثبوت کیا ہے؟ میں اب زیادہ معاف نہیں کرنا چاہتا یا معاف کیا جانا چاہتا ہوں اور سیدھی راہ پہ جانا چاہتا ہوں۔ میں اپنے مستقبل سے آنکھیں بند کرنا چاہتا ہوں یا اپنے ماضی کو بھولنا چاہتا ہوں۔

نہیں، میں اپنی قسمت سے فرار نہیں ہو سکتا۔ یہ پاگلانہ خیالات، یہ احساسات، یہ گزرنے والے تصورات جو مجھے آتے ہیں--- کیا وہ سچے نہیں ہیں؟ کسی بھی حال میں، وہ مجھے اپنے منطقی خیالات سے کہیں زیادہ قدرتی اور کم افسانوی دکھائی دیتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ میں آزاد ہوں لیکن میں اپنی قسمت کے ساتھ تھوڑی سی بھی مزاحمت نہیں کر سکتا۔ میری گردن میں پڑی ہوئی لگام اس کے ہاتھوں میں ہے جو مجھے پہلے اس راستے پہ کھینچتی ہے اور پھر اس راستے پر۔ یہ اس کی بنیاد ہے، زندگی کی بنیاد جس سے کوئی فرار نہیں کر سکتا۔ وہ مدد کے لیے چلا بھی نہیں سکتے۔ وہ لڑ بھی نہیں سکتے۔ احمق زندگی!

نہیں، نہ ہی میں زندہ ہوں اور نہ ہی سویا ہوا۔ مجھے کچھ بھی پسند نہیں ہے، مجھے کسی چیز سے بھی نفرت نہیں ہے۔ میں نے موت کو جان لیا ہے، میں نے واقعی ہی اس کی صعوبت میں لطف اُٹھایا ہے۔ وہ میری تن تنہا اور اکیلی دوست ہے، ایک ہی چیز جو مجھے خوش کرتی ہے۔ ماؤنٹ پاریسے کا قبرستان مجھے یاد آتا ہے۔ مجھے اب مُردوں سے کچھ زیادہ خوف نہیں ہے۔ میرا اسی دنیا سے تعلق تصور کیا جائے۔ میں اُن کے ساتھ ہوں۔ میں زندہ درگور ہو چکا ہوں---

میں تھک چکا ہوں۔ اس بکواس کو دیکھو جو میں نے لکھی ہے! میں خود بتاتا ہوں: ”جاؤ اور اپنی پنسل اور کاغذ دور پھینک دو، پاگل آدمی، ان کو دور پھینک دو۔ تم کافی بکواس کر چکے ہو۔ منہ بند کرو اور اس کو پھاڑ دو۔ خدا کے لیے، کسی بھی انسان کو کبھی یہ تلاش نہ کرنے دو۔“ وہ مجھے کیسے جانچیں گے؟ لیکن میں نے کسی سے کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ مجھے کسی بھی چیز کی کوئی پرواہ نہیں۔ میں دنیا اور اس کی ہر چیز پہ ہنستا ہوں۔ تاہم، بمشکل، وہ مجھے جانچ سکتے ہیں، وہ نہیں جانتے کہ میں نے خود کو اس سے زیادہ سختی کے ساتھ جانچا ہے۔ وہ مجھ پر ہنستے ہیں لیکن وہ نہیں جانتے کہ میں اُن سے کہیں زیادہ اُن پر ہنستا ہوں۔ میں خود سے نفرت کرتا ہوں اور ہر کسی سے بھی جو اس کو پڑھتا ہے۔

اس کی میز کی دراز سے، تاش کے پتوں کے ساتھ یہ نوٹس مل گئے تھے۔ وہ خود نیچے بستر پر گر گیا تھا اور سانس لینا بھول گیا تھا۔

☆☆☆☆☆

آپا بیگم

آپا بیگم کے ہاتھوں میں آج پھر دھاگہ اور سفید کرتا تھا، جسے وہ بڑے پیار سے ٹانک رہی تھیں۔ یہ ٹانکے وہ دل سے لگا رہی تھیں نفاست ایسی کہ ایک ایک دانہ موتیوں کی مانند دمک رہا تھا۔ ان کے ہاتھ میں صفائی ہی اتنی تھی۔ پھر چاہت سے وہ کام کر رہی تھیں اس کی بات ہی اور تھی۔ اماں رفیقہ انھیں مسلسل دیکھ رہی تھیں اور ان کے چہرے پر اداسی کی دبیز تہہ تھی۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر آپا بیگم کی خفگی کے خوف سے چپ رہیں۔

دھاگہ ختم ہوا تو آپا بیگم نے مزید دھاگہ ڈالا اور نظروں سے قدرے قریب کرتے کڑھائی شروع کر دی۔ موٹے موٹے شیشوں والی عینک بھی اب لگتا تھا ساتھ چھوڑتی جا رہی ہے مگر آپا بیگم کا جنون تھا کہ کم ہوتا نہ ختم ہوتا۔

آپا بیگم کا اصل نام سطوت جہاں تھا۔ ایک بھائی ارشاد جو ان سے بہت چھوٹے تھے آپا بیگم ان کی بڑی رعب دار بہن، ابا، اماں کی بے حد لاڈلی، نازک سی لچکدار ڈال والی آپا بیگم۔ یوں پورے حویلی میں آپا بیگم کی ڈھنڈیا و پکار رہتی۔ حویلی جو "جہاں آباد" کے نام سے موسوم تھی۔ قدیم طرز تعمیر کا نادر شاہکار، دلفریب نمونہ، بڑے بڑے برآمدے، راہداریاں، بالکونیاں، طویل و عریض صحن میں آم، امرود اور کینو کے درخت انار کے پھولوں جیسی رنگت نازک نین نقش والی سطوت جہاں انگور کی بیلوں پر لگے بڑے بڑے پتوں کو چباتی اور آنکھیں میچ لیتیں۔ پھر اماں کی ڈانٹ۔ وہ تھی ہی کھٹی چیزوں کی دیوانی۔ گلا دکھنے پر کڑوا کسیلا شربت نہ پینے پر جب اماں آنکھیں نکالتیں تو ابا اسے مٹھی گولیوں سے بہلا لیتے۔

"آپ بھی ناں! اس کو بگاڑ کے دم لیں گے۔" اماں گھورتیں تو آپا بیگم کی چوڑی چھاتی میں سما جاتیں۔ ارشاد مسکراتا تو وہ اسے ایک ہاتھ جڑ دیتی۔ سطوت کا رعب بھی خوب تھا اس پر۔

آم کی مضبوط شاخوں پر لگا جھولا ان کا دوست ساتھی، سہیلی سبھی کچھ تھا۔ اس سے آپا بیگم کے راز و نیاز چلتے رہتے۔ فرصت کے اوقات میں وہ یہیں پائی جاتیں۔ یہ اور بات کہ تپتی دوپہر میں اماں اور رفیقہ کی نظریں بچا کر خس لگے ٹھنڈے کمرے سے نکل کر وہ جھولے سے باتیں کر رہی ہوتیں۔ ابا میاں اپنی زمین داری میں الجھے رہتے کوئی اور رشتہ دار نہ تھا۔ سطوت بعض اوقات تنہائی کا شکوہ کرتی تو اماں

فصیحہ آصف خان

مسکرا دیتیں۔ "جو اوپر والے نے نصیب میں لکھ دیا۔ دے دیا صبر شکر کرو۔"
اماں اسے گھر کے کاموں، سلائی کڑھائی میں طاق کر رہی تھیں اور آپا بیگم نہ چاہتے ہوئے بھی کیریاں کھاتے ہوئے ان کی بات ماننے پر مجبور تھیں۔

دسویں کا امتحان کیا دیا، جوانی بہار بن کر سطوت پر ٹوٹ پڑی۔ گلاب کی ادب کھلی کلی یا کسی منہ بند شگوفے کی طرح، نازک اندام ایسی کہ آئینہ بھی شرما جاتا۔ رنگت میدہ شہد سے گھلی گلابوں کی گلابیت اور موتیے کی ملائمت لیے۔ اس کی خوشبو ادھر اُدھر بکھری تو سینکڑوں پیام آنے لگے۔
"میں اپنی سطوت کو کہیں نہ جانے دوں گا۔" ابا کہتے تو اماں ان کی نفسیات پر مسکرا دیتیں۔
"بھلا بادشاہوں کی بیٹیاں بھی گھر بیٹھیں، ضیا جی یہ تو چڑیاں ہیں۔ آج اس ڈال کل سسرال کی ڈال پر۔ بس اس کے روشن مقدر کی دعائیں کریں۔"
"ہاں..... ہاں میں دعائیں نہیں کروں تو اور کون کرے گا۔" ضیا الدین صالحہ کو مسکرا کر مطمئن کرتے ہوئے کہتے تو وہ "آمین" کہتیں۔
سطوت کی الہڑ جوانی میں اس وقت بھونچال آیا جب ابا میاں کی اکلوتی بہن نزہت جہاں برسوں بعد بھائی سے ملنے آگئیں۔ آتیں بھی کیسے، اپنی پسند سے شادی کر کے دوسرے شہر میلوں دور جا بسی تھیں۔ ابا کا وقار مسلا، اماں کا کلیجہ جلایا، بھائی کے ناموس پر حرف آیا۔ گھر کے دروازے ان کی رخصتی کے ساتھ ہی ان پر بند ہو گئے۔ اماں، ابا کے گزر جانے کے بعد بھائی نے رسم نبھائی مگر اندر ہی اندر نزہت جہاں کے لیے دل تڑپتا رہتا۔ انا اور خودداری کا علم نہ صرف بلا دیا بلکہ گرا بھی دیا۔ دونوں بھائی بہن یوں ٹوٹ کر روئے کہ ساون کو بھی مات دے ڈالی۔
نزہت جہاں کا اکلوتا بیٹا خلیل احمد بھی ہمراہ تھا۔ باپ کے گزر جانے کے بعد اس نے ماں کی خواہش کو پورا کیا۔ خلیل احمد کو دیکھ کر ابا اماں حیران ہی تو رہ گئے۔ کیسا بانکا سجیلا نوجوان تھا۔ چودھویں کے امتحان میں اول آیا تھا۔ ایم اے کر کے باپ کا کاروبار سنبھالنا تھا۔ اکلوتا تھا تو آنکھوں کا تارا بھی تو تھا۔ سطوت جہاں سے مل کر نزہت کو اپنا بچپن یاد آ گیا۔ وہ بھی ایسی لچکدار شاخ کی مانند تھیں۔ جب ایک پردیسی کلاس فیلو ان کو دیکھ کر دل ہار بیٹھا۔ نہ ذات سے میل کھاتا تھا نہ ان کی برابری کا تھا مگر اس کا دل محبت سے بھرا تھا۔ اماں، ابا کب مانتے۔ اس نے خودکشی کی دھمکی دی تو اس شرط پر دل پسیجا کہ رخصتی کے بعد وہ اس دہلیز کو پار نہ کرے گی۔ واپسی کے لیے۔ منہ زور جوانی تھی۔ نزہت بھی ضد کی پکی نکلی۔ مڑ کے نہ دیکھا اور

پرائی ہوگئی۔

اس سے شادی کے بعد جمیل احمد کی قسمت جاگ اٹھی۔ مٹی کو ہاتھ لگاتے تو سونا بن جاتی۔ نزہت ان کے لیے بھاگوان ثابت ہوئی تھی۔ خلیل آیا تو خوشی دوچند ہوگئی۔ نزہت نے بارہا سوچا کہ جہاں آباد جائے مگر ضد آڑے آئی۔ پھر جس باپ کا شملہ وہ گرا آئی تھی کیسے اٹھاتی، اتنی ہمت کہاں سے لاتی کہ ان بے بس نظروں کا سامنا کر پاتی۔ خلیل نے ماں کو اکثر روتے پایا۔ اسے معلوم تھا وجہ کیا ہے؟ جب ایک رات جمیل احمد چپکے سے انھیں چھوڑ گئے تو نزہت نے خود کو بے حد ٹوٹا ہوا پایا۔

عدت گزرتے ہی خلیل، ماں کو لے آیا۔ اب اس نے کاروبار بھی سنبھال لیا تھا۔ اماں، ابا کے جانے کا سنا تو آنکھوں سے غموں کا سیل رواں جاری ہوگیا۔

"موت پر کس کا اختیار ہے، موت تو برحق ہے۔ آپ کو ابا اماں نے معاف کر دیا تھا۔" ضیا الدین نے بہن کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ ہچکیاں لینے لگیں۔

"میں تو ان کے پاؤں پڑ کر معافی طلب کر لیتی، آخری پل ان کے ساتھ بتانا چاہتی تھی ضیا۔" ان کا وجود زلزلے کی زد میں تھا۔ تب صالحہ نے انھیں سنبھالا اور تسلی دی اماں، ابا کے لیے جائیداد میں حصہ بھی مقرر کر گئے تھے مگر نزہت کو کسی پل چین نہیں تھا۔ نزہت بار بار آہیں بھرتی۔ اماں ابا کو یاد کرتی، اب تو پچھتاوے تھے۔

خلیل احمد اس نازک اندام تتلی کو دیکھ کر دم بخود ہی تو رہ گئے تھے۔ لمبے سنہری بالوں کی گندھی ہوئی کشمیری سیب جیسے دہکتے گال، آواز ایسی کہ کوئل کوک رہی ہو، چال ایسی کہ ہرنی قلانچیں بھر رہی ہو اور آنکھیں صد ہزار جگنو کی چمک کو بھی ماند کر دیں۔ سرو قد لمبا سراپا۔ وہ آکاس بیل کی طرح خلیل احمد کے حواسوں پر سوار ہو رہی تھی۔

کئی دنوں کی کشمکش کے بعد وہ ماں کے سامنے دستِ سوال کرتے کرتے حال دل عیاں کر بیٹھے۔

"اماں بس مجھے سلوت چاہیے۔" بیٹے کی مراد سن کر نزہت سوچوں میں ڈوب گئیں۔ ضیا الدین اور صالحہ بھی ان کی خواہش پر گومگو کیفیت میں تھا بھی سولہ سترہ کا سن تھا۔

"ہمیں سوچنے کا موقع دیں۔" ضیا الدین فکر انگیز لہجے میں بولے۔ کس سے مشورہ کریں، دونوں آپس میں الجھتے رہے۔ نزہت کو جلدی ہی جلدی تھی کہ بھائی انکار کر کے جی برا نہ کرے۔

"ارے بھیا میں کون سا ابھی بارات لیے بیٹھی ہوں۔ تم ہاں کر کے مجھے تسلی تو دے دو۔ برسوں بعد دل پھر جی اٹھے گا۔" نزہت بھرائے لہجے میں بولیں تو ضیا الدین چپ ہوگئے۔

موسم کی بے قراریاں تھیں کہ تھمنے میں نہ آرہی تھیں۔ برسات اپنے جوبن پر تھی۔ آم پر کوکتی کوئل من بہلا رہی تھی۔ دھواں دھار برستی بارش میں رفیقہ نے پکوڑوں کی کڑاہی چڑھا دی۔ ساتھ میں املی کی کھٹی میٹھی چٹنی۔ اماں گلگلوں کی تیاری میں لگ گئیں۔ بالکنی میں کھڑی سطوت بارش کی بوندوں کو ہاتھ میں لیتی اور ہنستی کہ خلیل نے آکر اس کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

سطوت کا سانس رکنے لگا۔ ہاتھ خلیل کی مضبوط گرفت میں تھے۔ اس نے ہاتھ چھڑانا چاہے مگر وہ تو جیسے کسی مقناطیس کی طرح ایک دوسرے سے پیوست تھے۔ چپکے ہوئے تھے۔

''چھڑانا چاہتی ہو؟ چھڑا کے دیکھ لو۔'' خلیل کی جذبوں کی یورش میں گندھی آواز، سطوت کو بے خود کر گئی۔

''محبت کی پہلی بارش میں دونوں بھیگ رہے تھے۔ مست بے پروا...... چاہتوں کا جھولا اونچے سے اونچا ہوتا جا رہا تھا۔ دونوں کے کپڑے بھیگ گئے تھے۔ کب پروا تھی کہ اس بھیگتی بارش میں ان جذبوں سے نگاہ چرائیں، دامن بچائیں۔

''میں نے اماں بیگم سے تمہارے ساتھ کی بات کی ہے۔ تم نے ہمارے دل و دماغ پر قبضہ کرلیا ہے۔'' وہ ہنسے۔

''سطوت اب ہم تمہارے بنا جی نہ پائیں گے۔''

خلیل آج گویا سارے جذبے انڈیل رہے تھے اور سطوت دل کی ہلچل چھپائے خود پر قابو پانے میں ناکام ہو رہی تھی۔ سطوت نے گھنی پلکیں کیا اٹھائیں، خلیل نے اپنا عکس دیکھا تو مبہوت ہی تو رہ گیا۔ دونوں کے معصوم، الہڑ جذبے اور گواہ بارش......

سطوت جلدی سے ہاتھ چھڑا کر اندر بھاگی۔

بارش نے گویا سماں ہی باندھ دیا تھا۔ پکوڑے، گلگلے، آم، کوئل کی کوک، مٹی کی خوشبو......! لاہور کی بارش نے کراچی والوں کے دل جیت لیے تھے۔

نزہت کو ضیا الدین نے ہاں کی تو ان کو جہان بھر کے خزانے مل گئے۔ ان کے جانے کے دن قریب آگئے تھے۔ ضیا الدین کا دل کہاں بھرا تھا۔ خود نزہت بھی پیاسی تھی۔ سیراب کہاں ہوتا ہے دل میکے کی محبت سے۔ سطوت کا دل بھر بھر آ رہا تھا۔ گویا ساون آنکھوں میں ہی آن بسا ہو۔

''ہم بہت جلد آئیں گے۔ ہمارا انتظار کرنا۔'' خلیل احمد کے وعدوں کے سنہری دھاگے اس کی سوچوں کے گرد حصار باندھ گئے۔

نزہت نے جاتے سے خوب صورت دوپٹہ سطوت کو اوڑھایا اور گلے لگا کر بولیں۔

''اب یہ میری امانت ہے ضیا الدین۔'' سطوت شرما گئی۔ ضیا الدین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

سطوت کے رات دن خلیل کے خیالوں میں

گزرتے۔ آنے والے دنوں کے خوشگوار تانے بانے بنتی رہتی۔ خطوط کے ذریعے رابطہ رہتا۔ نزہت نے آنے میں جلدی کر دی جانے کیوں وہم لاحق تھا۔ نزہت نے سیدھا سیدھا نکاح کا کہہ دیا۔ ضیا الدین اور صالحہ کو بھی اعتراض نہ ہوا۔ سو ایجاب وقبول کے بعد دونوں ایک ہو گئے رخصتی سال بعد قرار پائی۔

نزہت بے شمار چیزیں لائی تھیں۔ سب کے سوٹ، سطوت کا خاص طور پر دلہن والا جوڑا، بڑا سا سونے کا سیٹ، جوتے وغیرہ۔ خلیل نے نکاح کے بعد سطوت کو بے حد قیمتی اور خوب صورت انگوٹھی پہنائی۔

"اسے کبھی خود سے جدا مت کرنا۔" خلیل نے پیار بھری سرگوشی کی اور سطوت نے اسے دل کے پلو سے باندھ لیا اور مضبوط گرہ کر لی۔

مزید دو دن رکنے کے بعد نزہت نے واپسی کا قصد کیا اور کہا کہ اب خلیل کی ساری توجہ کاروبار پر ہو گی تو وہ کچھ عرصے بعد اپنی امانت واپس لے جائیں گی آ کر۔"

یوں رابطے میں رہتے چار ماہ گزر گئے۔ صالحہ جہیز کا سامان تیار کرتی دکھائی دیتیں اور سطوت جھولے پر بیٹھی خیالوں میں خلیل سے باتیں کرتی۔ مسکراتی رہتی۔ صالحہ اسے زیادہ تر کاموں میں الجھائے رکھتیں کہ وہ ہر ہنر سیکھ لے۔

اچانک نزہت کی طرف سے خاموشی چھا گئی۔ خط کا جواب نہ آتا۔ فون کرتے تو لائن نہ ملتی۔ ضیا الدین کا دل دھڑکا۔ دل وسوسوں کا شکار ہو چلا تھا۔

انھیں دل کا پہلا دورہ پڑا۔ صالحہ کی روح تک کانپ گئی۔ کیسے جاتے معلوم کرتے کیسے بھیجتے فشار خون بلند رہنے لگا۔ ڈاکٹر سوچوں سے پرہیز کو کہتے مگر وہ تو اوپری سطح بھی چھوڑتی جا رہی تھیں۔

دو ماہ اور گزرے۔ ایک رات دماغ کی نس پھٹی اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ گھر پر اداسیوں کا راج ہو گیا۔ کسی انہونی کا اشارہ سا دکھتا تھا۔ صالحہ نے بھی ایک روز چپ چاپ سفرِ آخرت کی تیار کر لی۔

سطوت تو جیسے بوکھلا سی گئی۔ ارشد دوسرے شہر پڑھتا تھا مہینے بعد چکر لگاتا۔ ایسے میں رفیقہ کا ساتھ کسی رفیق سے کم نہ تھا۔ رفیقہ جو ملازمہ کم اور ساتھی زیادہ تھی۔ ادھیڑ عمر بیوہ نہ کوئی بچہ۔ دور پار کے چند عزیز کسی گاؤں میں رہتے تھے۔ رفیقہ برسوں سے یہیں تھی۔ نمک خوار تھی۔ سطوت کو تنہا کیسے چھوڑتی اور جاتی بھی کہاں؟ اس کا کب کوئی اور ٹھکانہ تھا۔ سطوت قسمت کے اس پھیر پر حیران وہراساں تھی۔

خلیل اور نزہت کی کوئی خبر نہ تھی۔ انھیں دونوں کے انتقال کی خبر دے دی گئی تھی۔ چار ماہ اور گزرے۔ اس روز سطوت غسل خانے میں تھی جب ڈاکیا آیا۔ کراچی سے خط آیا تھا۔ اُف کس قدر پرانی تاریخ تھی۔ چھ ماہ پہلے کا خط۔ اب ملا۔ رفیقہ نے بددیانتی کی اور خط کھول لیا۔ نزہت نے

کسی سے لکھوایا تھا۔

میں اور خلیل خریداری کر کے آ رہے تھے کہ ایک ٹرالر نے انھیں بری طرح کچل دیا۔ خلیل موقع پر جاں بحق ہو گیا اور میں موت وحیات کی کشمکش میں ہوں۔ اگلے خط میں ان کی بھی وفات کی خبر تھی...... ! سب ملیا میٹ ہو گیا۔

رفیقہ نے دل پر ہاتھ رکھ دیا اور اشکوں کو دل پر گراتی اسے اپنے صندوق میں کپڑوں کے نیچے کسی رازکی طرح دفن کر دیا۔

سطوت کے ہونٹوں پر جامد چپ رہنے لگی تھی۔ خاموش اداس سفید ململ پر کڑھائی کرتی۔ دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ رنگت زرد، آنکھیں ماند پڑتی جا رہی تھیں۔ رفیقہ اسے دیکھ دیکھ کر ہولتیں۔ سچ بتانے کی ہمت نہ تھی۔ آس توڑتی تو سانس کی ڈور ٹوٹتی۔ ارشد آتا وہ ایک لا پروا سا نوجوان تھا۔ پھر آپا بیگم کا رعب و دبدبہ ابھی آنے والے حالات سے نابلد لگا۔ اسے موجودہ حالات کا بھی اندازہ نہ تھا۔ سطوت اس کا خیال رکھتی۔ وقت پر رقم تھما دیتی۔ وہ پڑھائی میں اچھا تھا۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والا معاملہ تھا۔ رفیقہ ہی بس اس راز کو محسوس کر کے اشک بہاتی رہتی۔

سالوں پر سال گزرتے گئے۔ ماہ و سال کی گردش جاری و ساری تھیں نہ بدلا ؤ آیا تو آپا بیگم میں وہی آس، امید اور انتظار۔ گرتے کا ڈھتیں، نظریں اتارتیں اور سنبھال کر رکھتی جاتی۔

رفیقہ سسکتی رہ جاتی اسے سطوت عزیز تھی۔ وہ اسے کھونا نہیں چاہتی تھی۔ موسم بدلتے گئے۔ حویلی میں بوسیدگی زور پکڑتی گئی۔ مگر امید جوان اور توانا تھی۔

رفیقہ نے ایک روز سطوت کو شادی کا مشورہ دے ڈالا۔ وہ بھونچکا ہی تو رہ گئی۔ رفیقہ نے سمجھانا چاہا مگر اس نے ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔ ارشاد بار بار کہتا۔ سطوت کی ”ناں“ ”ہاں“ میں نہ بدلی۔

”میں پتا کر آیا ہوں۔ وہاں کوئی نہیں۔ اب ان کا انتظار کرنا فضول ہے۔“ ارشد اب بچہ نہ تھا۔

سطوت کے دل پر گھونسا پڑتا۔ وہ انگوٹھی دیکھتی اور رو پڑتی۔ ارشد تھک ہار کر باہر چلا گیا اور وہیں شادی کر لی۔ سطوت کا لمحہ لمحہ سراپا انتظار رہتا۔ دہلیز کو تکتا رہتا۔

آم کے پیڑ پر اب کوئل کوکتی نہ تھی کہ کرلاتی تھی۔ ساون آتا تو آنکھوں میں جھڑی لگ جاتی۔ سردیوں کی طویل راتوں میں خلیل کے جذبوں کی گرماہٹ اسے بے قرار کرتی۔

برس بیتتے گئے۔ رفیقہ میں دم خم ختم ہو رہا تھا۔ کمزوری تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔ بڑھاپا صدموں کی وجہ سے جلد آن وارد ہوا۔ وہ زیادہ تڑپتی رہتی۔ حویلی میں صفائی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ بہار خزاں میں بدل گئی تھی۔

تب وہ خلیل احمد کو پکار اٹھتیں۔ بے اختیار ہو کر۔ ”کس بھنور میں چھوڑ گئے ہو۔ خدارا! چلے آؤ۔ موسم بھی پلٹ کر آ جاتے ہیں تم نے تو خبر ہی نہ لی۔“ رات بھر وہ سسکتی رہتی۔

"آپا بیگم! اتنے برس بعد تو نکاح بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ آپ نے بہت غلطی کی۔ خلیل کے لیے سراپا انتظار بنی جوانی تیاگ دی۔ روپ اجاڑ دیا۔ بہار خزاں میں بدل ڈالی اپنے آپ پر بہت ظلم کیا۔ آپا بیگم آپ نے۔" رفیقہ تڑپ کر رو پڑتی۔

"اللہ ہے ناں۔ وہی مالک وہی رازق ہے۔" امید آس کا پنچھی ابھی بھی وقت کی قید میں تھا۔

"انھیں اپنی پناہ میں رکھ لو۔ رفیقہ یہ بہت دکھوں کے مارے ہیں۔" شبیر بھائی کہتے ہوئے رو پڑے۔

"ایں..... کیا..... یہ گھر ہے سرائے یا ٹھکانہ نہیں۔" رفیقہ نے دو ٹوک الفاظ میں سختی سے کہا۔ تو آپا بیگم نے حامی بھر لی۔

لڑکی صغریٰ گھر سے بھاگ کر آئی تھی۔ یہاں اس نے نذیر سے نکاح کر لیا۔ اب اس کے گھر والے جان کے دشمن بن گئے تھے سو شبیر انھیں یہاں لے آیا۔ یہاں انھیں کوئی خطرہ نہ تھا۔ آپا بیگم کو بھی سہارا درکار تھا۔ رفیقہ کو شاید اس کا انتظار تھا۔ ہفتہ بھی نہ گزرا کہ اوپر والے نے بلا بھیجا۔

آپا بیگم کا صدموں سے کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ ایسے میں صغریٰ نے انھیں سنبھالا، وہ بہت سادہ اور محبت کرنے والی لڑکی تھی۔

آج دھوپ کھل کے نکلی تو آپا بیگم نے رفیقہ کے کمرے کا سامان نکلوایا۔ کمرہ صاف کروایا۔ صندوق کھولا جا رہا تھا کہ کپڑوں کی تہہ سے ایک خط نما کاغذ برآمد ہوا۔ بوسیدہ پرانا مگر حرف صاف پڑھے جا رہے تھے۔ صغریٰ اَن پڑھ تھی۔ آپا بیگم کو دکھانے چلے آئی۔

برسوں پرانا خط نزہت کا! آپا بیگم کا دل تھم گیا۔ جیسے جیسے خط پڑھتی گئیں اشکوں کا سمندر آنچل میں سمٹنے لگا۔ آخری سطر تک وہ بے دم ہو گئیں۔

"مجھ سے رفیقہ بڑی خبر چھپا گئی۔ ایسا دھوکا۔ ایسی قیامت خبر..... اندوہناک خبر! برسوں راز سینے میں دفن کیے خود بھی دفن ہو گئی رفیقہ۔ کس سے جواب مانگوں اب مر تو نہ جاتی میں اس خبر سے، اب بھی تو زندہ ہوں رفیقہ تم نے بہت برا کیا میرے ساتھ۔"

خط کیا تھا قیامت کا مژدہ تھا۔

وہ رات آپا بیگم کے لیے سیاہ ترین رات تھی۔ آس، امید کی آخری رات۔

صبح ہوئی تو سب کُرتے بانٹ دیے اور اب آپا بیگم کے ہاتھ میں سوئی دھاگے کی جگہ سفید دانوں والی تسبیح تھی اور سر پر سفید ململ کا دوپٹہ جس سے انھوں نے خلیل احمد کے لیے کُرتا بنانا تھا اب اوڑھنی بنا انھیں سالوں بعد بیوگی کا احساس دلا رہا تھا۔ اب ان کی انگلی دیکھنے والوں نے پہلی بار بنا انگوٹھی کے دیکھی جو خط کے کاغذوں میں لپٹی کپڑوں کی آخری تہہ میں پڑی تھی۔

☆☆☆☆☆

”ہوا سے مکالمہ“

دریا کے کنارے ماضی کے آتش دان میں یادوں کی آگ جلا کر بیٹھا تھا۔ ہر سمت ایک حسین خاموشی تھی۔ فضا پر مسرت تھی۔ پانی کا بہاؤ جب کلام کرتا ہے مجھے بہت سکون دیتا ہے۔ اور پھر ان چاندنی راتوں میں پانی دریا میں آکر دیپک راگ سنانے لگتا ہے اس خوبصورت فضا میں دیر تک اپنے ماضی کے بارے میں سوچتا رہا کہ ہر روز میرا ایک دن گم ہو جاتا ہے آج مجھے لگتا ہے۔ جیسے میری کئی صدیاں گم ہو گئی ہو۔ جب ماضی کے بھنور سے نکل کر ہوش سنبھالا تو معلوم ہوا، کہ بہت دیر سے میری دوست میرل میرے پاس بیٹھی تھی۔

(میرل ایم فل اردو کر چکی تھی اب یونی ورسٹی میں لیکچرار تھی)

میرل خاموشی توڑتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئی۔

نوفل ------ برف کی طرح خاموش ہی رہو گے یا آبشار بھی بنو گے۔

نوفل ایک بات بتاؤ تم ماضی سے اتنا پیار کیوں کرتے ہو۔

نوفل نے سانس لیتے ہوئے کہا مجھے بیتے ہوئے کل اور گزرے ہوئے زمانے سے زیادہ ان لوگوں سے پیار ہے جو محبت سے آشنا اور نفرت سے بیگانہ تھے۔۔ وہ کیا دور تھا جب پورے گاؤں میں صرف ایک آدمی کے پاس گھڑی ہوا کرتی تھی۔ مگر وقت کی قدر ہر کوئی جانتا تھا۔ اب ہر ہاتھ پر گھڑی ہے۔ مگر وقت کی اہمیت اور قدر کسی کے پاس نہیں۔

میرل میرا دادا مجھے کہا کرتا تھا۔ بیٹا ”ایک وقت ایسا آئے گا۔ جب زہروں کے نرخ مقرر ہوں گے و بدترین زمانہ ہوگا۔ اس دور میں زہریلے سانپ ہی معتبر ٹھہریں گے۔ اور پھر زندگی کا کیلنڈر دسمبر کی آخری تاریخوں کی طرح بجھ سا جائے گا“ مجھے تو یوں لگتا ہے یہ اس زمانے کا آغاز ہے۔

نوید عائل

میرل نے دھیمی آواز میں کہا---- کہ آج اور کل میں کیا فرق ہے؟

نوفل------ پہلے لوگوں کو کردار کے حوالے سے پہچانا جاتا تھا اور اب عہدے اور سٹیٹس کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ ہم ایک ایسے دور میں داخل ہوئے ہیں جہاں جس کو اپنے ضمیر کا سب سے زیادہ معاوضہ ملتا ہے وہی کامیاب آدمی کہلواتا ہے۔

میرل---- آخر یہ لوگ ایسے کیوں کرتے ہیں نوفل کیوں اپنے ضمیر کا سودا کرتے ہیں۔ کیوں اپنے خونی رشتوں کو کچھ روپوں کے لئے بھول جاتے ہیں؟

کیوں کہ یہ لوگ مہنگے خواب خریدنا چاہتے ہیں اور مہنگے خواب خریدنے کے لئے شرط یہی ہوتا ہے کہ ہمیں اپنی انکھیں بیچنی پڑتی ہے اور جب آنکھوں کو بیچا جاتا ہے پھر رشتوں ناطوں، یاروں اور دوست کی پہچان نہیں رہ پاتی۔

میرل تمہیں پتہ ہے یہاں زندہ لاشیں چلتی پھرتی ہے------ میرل وہ کیسے؟

نوفل---- کیوں کہ "گورکن نے اپنے کتاب میں مردہ اسے قرار دیا ہے۔ جس کی قبر پر کوئی نظر نہیں آتا" اور آج تم دیکھ لو معاشرتی زندگی کو اس مادیت نے اس قدر متاثر کیا ہے۔ جیسے یہاں کی تہذیب اجڑ چکی ہو۔

میرل نے سانس بھرتے ہوئے ادھر ادھر دریا کے کنارے اور پیڑوں پر نظر دوڑائی اور کہنے لگی کہ تم نے ایک بات محسوس کی ہے------ میں نے کہا کون سی بات؟

نوفل جب ہم چھوٹے ہوا کرتے تھے۔ تو دریا کے کناروں پر بے شمار پرندے ہوا کرتے تھے۔

نوفل مسکرایا اور کہنے لگا کیا تمہیں پتہ نہیں کہ بارود اور نفرت کی آگ میں پرندے ہجرت کرنے لگتے ہیں---- یہ ہجرت بھی عجیب شے ہیں پرندے اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے اپنے تیار کردہ گھونسلے چھوڑ دیتے ہیں اور آج کل مشرق میں یہ رواج عام ہوا ہے کہ محض مال و دولت کے حصول کے لیے اپنے والدین، بھائی، بہنوں، رشتوں، ناطوں کو فراموش کر دیتے ہیں۔ چلو مان لیا وقت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ملک، قوم اور والدین سے دور ہوئے مگر کامیاب ہونے پر تو انسان واپس لوٹ کے آتا ہے۔ اپنی منزل پا کر اپنے والدین کے سائے میں پناہ لینے کے لیے آتے ہیں۔ اپنی تھکاوٹ دور کرنے کے لیے ماں کی گود میں سر رکھ کر سو جاتا ہے۔ مگر افسوس آج کے بچے بہت بدل گئے۔

انہیں کیا خبر کہ اولاد کی جدائی سے ماں باپ کی آنکھیں ساون جھڑی کی طرح برسنے لگتے ہیں۔ اولاد کی جدائی میں ماں

باپ راکھ میں دبی چنگاری کی طرح عمر گزار دیتے ہیں۔

میرل تمہیں یاد ہے۔ ایک دن آپ نے مجھ سے سوال کیا تھا۔ کہ تمہیں دریا سے اتنا عشق کیوں ہے۔ تو اس کا جواب آج ہی دیتا ہوں ------

مجھے دریاؤں کی اس صفت سے عشق ہے چاہے وہ جتنا بھی سفر کرلیں ان کی منزل سمندر ہی ہے۔

نوفل ایک بات بتاؤ تمہیں مغرب سے اتنا خوف کیوں ہے؟

میرل جہاں سورج غروب ہوتا ہے۔ وہاں اندھیروں کا راج ہوا کرتا ہے۔ اور آفتاب مغرب کی جانب غروب ہوتا ہے۔ اس لئے مجھے مغرب سے خوف ہے۔ وہاں اندھیرا ہے۔ وہ روشنی کے ہوتے ہوئے اپنی موجودگی کا ثبوت دیتا ہے۔ اس لئے اندھیروں میں گم ہونے والا تو مل سکتا ہے۔ مگر جو لوگ روشنی میں گم ہو جائیں کبھی نہیں ملتے۔ آج کے نوجوان مغرب اس لیے جاتے ہیں تا کہ وہاں بے انتہا دولت اکٹھا کرلیں اور موج مستی میں زندگی ایک بے لگام گھوڑے کی طرح گزار دے۔ مگر ان نادانوں کو کیا خبر اکثر جب ہوس زیادہ ہو جاتا ہے۔ تو رزق کم ہو جاتا ہے۔

میرل ----- تو پھر اس مادہ پرستی کے دور میں زندگی کو کیسے پرسکون اور اطمینان بخش بنا دیا جائے۔

نوفل ------ لہروں کا گیت سننے کی کوشش کرو احساس کی ساری دنیا انہی لہروں کے گیت پر رقص کر رہی ہے اور دوسرا کام کہانی سنا کرو کہانی سننے سے انسان کے اندر کا بچہ زندہ رہتا ہے۔ اور جب اندر کا بچہ زندہ رہتا ہے۔ تو انسان ہمیشہ انسانیت کے معراج پر فائز رہتا ہے۔

چلو میرل بہت دیر ہوئی مگر جانے سے قبل مجھ سے ایک عہد کرلو۔۔

میرل ------ کونسا عہد؟

نوفل ----- اس مادہ پرستی کے دور میں ہم ایک ادیب کا کردار ادا کریں گے۔ کیوں کہ ادیب ہی ایسا شخص ہوتا ہے۔ جو معاشرے کے اندر سے انسانی اقدار کو تحفظ دے کر انہیں پروان چڑھنے میں مدد دیتا ہے۔

میرل مجھ سے یہ عہد کرلو کہ اس تہذیب کو اجڑنے نہیں دیں گے۔ کیوں کہ جب کوئی تہذیب اجڑتی ہے تو حساس انسان اپنے ہی وجود میں مہاجر بن جاتا ہے --------

جب میں نے میرل کا چہرہ دیکھنے کے لیے گردن موڑی تو میرل وہاں نہیں تھی۔ میرا سر چکرا گیا، پھر مجھے ہوش آیا تو مجھے یاد آیا کہ میرل اپنے کزن کے ساتھ شادی کرکے تین سال پہلے ہی کینیڈا جا چکی ہے ----------

☆☆☆☆☆

گُمان

خواب اور حقیقت میں
فاصلہ تو ہوتا ہے
ہاں کبھی کبھی جاناں
فاصلے گمانوں کے
فاصلے سرابوں کے
کم ضرور ہوتے ہیں

خواہشوں کے محور پر
آرزو کے مرکز پر
دل سے دل کی باتیں ہم
خود ہی کرتے رہتے ہیں
خود ہی سنتے رہتے ہیں
بارشوں کے موسم میں
بھیگ بھیگ جاتے ہیں
اور جلتے خوابوں کو
چاہتوں کی بوندوں سے
خود ہی پھر بجھاتے ہیں
اور بھول جاتے ہیں

سید افسر ساجد

دو مختصر نظمیں

شیطانی چکر

جو
ظلم کی راہ میں
آتا ہے
وہ اکثر
مارا جاتا ہے
پھر
اُس کے نام کے
پرچم سے
ظلم
اپنے جرم
چھپاتا ہے

ذرا سوچو!

جتنا زور
لگایا تم نے
میرے خواب بدلنے میں
ٹیڑھا ترچھا چلنے میں
اتنے سے تو
سوچ تمہاری اپنی
سیدھی ہو جاتی
ہستی اجلی ہو جاتی

جلیل عالی

سبز گنبد

عجم سبز گنبد عرب سبز گنبد
زمان و مکاں کا لقب سبز گنبد
ہمیشہ ہُرا ہے تمنا کا موسم
نہیں میرا دم ساز کب سبز گنبد
یہی ہے بہشت اور یہی اپنی دُنیا
ہمارا نشانِ ادب سبز گنبد
نگاہوں میں بھر کر نگاہیں جھکاؤں
مرے سامنے آئے جب سبز گنبد
تمنا ہو میرے بھی دل کی یہ پوری
دِکھا دے مجھے میرے رب سبز گنبد
نہ کیوں ناز ہو اپنی قسمت پہ خاور
تسلّی کا جب ہے سبب سبز گنبد

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چلو دل اُس کا وفا دار کر کے دیکھتے ہیں
خدا کے ساتھ یہ بیوپار کر کے دیکھتے ہیں

دو مختصر نظمیں

کمپرومائز

ہم ہیں تاریکیوں سے خوف زدہ
روشنی سے بھی خوف کھاتے ہیں
اپنی مُشکل کا حَل یہ سوچا ہے
بلب کمرے کا ہم جلائیں ، مگر
آپ برآمدے میں جا بیٹھیں !

ترقّی

ٹیلی فون بھی کیسا آلہ ہے
جس پر
دُنیا بھر میں جس سے چاہو
باتیں کی جاسکتی ہیں
لیکن اپنے آپ سے رابطہ کرنا ناممکن !

نسیمِ سحر

کورے کاغذ کی تحریر

خالد علیم

تمھارے نام میں نے ایک خط کل ہی تو لکھا تھا
وہ آیندہ کسی کل تک تمھارے پاس پہنچے گا تو پڑھ لینا
مگر میں چپ، سراسیمہ، پریشاں مُو
مسلسل فون کی گھنٹی مجھے بے چین کرتی جا رہی تھی
میں نے جتنے لفظ لکھے تھے، وہ سب گھنٹی کی بک بک میں
شکستہ حرف بن کر وقت کے قرطاسِ ابیض پر
سیاہی سے سفیدی میں بدلتے جا رہے تھے
تب نہ کوئی لفظ باقی تھا، نہ کوئی حرف روشن تھا
مرے احساس کی خوشبو میں ڈھل کر
لفظ جو لکھنے میں باقی رہ گئے تھے
وہ تمھارے فون کی بک بک سے مردہ ہو چکے تھے
خیر مجھ کو اس سے کیا مطلب!
کہ میں چپ چپ، سراسیمہ، پریشاں مُو
نئے لفظوں، نئے حرفوں کی آرایش میں،
بے ترتیب قصّے میں الجھتا جا رہا تھا
سماعت میں اُترتی فون کی بک بک سے آزردہ
تمھارے نام میں نے ایک خط کل ہی تو لکھا تھا
وہ آیندہ کسی کل تک تمھارے پاس پہنچے گا تو پڑھ لینا
مگر میں چپ، سراسیمہ، پریشاں مُو۔۔۔!!

رات گہری ہوئی ہے

کتابِ وفا کے اِن اوراق کی خستگی دیدنی ہے

کہ لگتے نہیں حرف پہلے سے روشن

توانائی آنکھوں کی بجھنے لگی ہے

دعا مر چکی، بے دلی بڑھ گئی ہے

مگر آس پودے کی ٹہنی پہ دیکھو

نئے پتّے بھی ہیں نئے پھول بھی ہیں

سماعت پہ مدھم سی دستک ہے اَب بھی

آس ہے تا ابد..... آس کی روشنی ہے

یہی زندگی ہے

اسلام عظمی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہُوبہُو وہی آواز ، ہُوبہُو وہی انداز

تجھ کو مَیں چھپاؤں کیا مجھ میں رنگ تیرے ہیں

حرص کی بساط

حرص کی دنیا بھی جیسے
ٹیڑھی میڑھی، تنگ گلیوں میں نہایت
خوش نما، رنگیں تھڑا ہے
گرمیوں کی شام ہو
یا
سردیوں کی دوپہر ہو
یہ سدا آباد رہتا ہے

یہاں شطرنج کی بازی لگانے آج جو
آئے ہوئے ہیں
کل نہیں تھے
اور تھے ان کی جگہ
اِن سے بھی بڑھ کر چال باز و ماہر فن
اب نہیں ہیں

طمع کے منہ زور شہ نے
فیل، گھوڑے اور پیادے
ڈال رکھے ہیں زیادہ سے زیادہ نفع
اندوزی کے خانوں میں
حدوں سے آگے جاتی
خواہشوں کا بھوت اپنا شاطرانہ سر کھجاتا ہے
نئی چالیں بدلتا ہے
مگر
قدرت کا جو اسپِ اجل ہے
یہ بڑا بے رحم ہے
یک لخت ڈھائی خانوں کی
ایسی انوکھی چال چلتا ہے
بساطِ زندگی کے شاہ کو
بچنے کی کچھ مہلت نہیں ملتی
وہ خالی ہاتھ ملتا ہے

طالب انصاری

سبز رتوں کا نقیب قائد!

احمد جلیل

انمول آرزوئیں جو ارمان دے گیا
تزئینِ گلستاں کے جو سامان دے گیا
توقیر دے گیا جو ہمیں شان دے گیا
آزادیِ وطن کا ہمیں مان دے گیا
نام اس کا دوستو ہے محمد علی جناح
ملت کو منزلوں کی جو پہچان دے گیا
جتنے ترقیوں کے ہیں عنوان دوستو
تنظیم و اتحاد اور ایمان دوستو
عزت یہ اپنی دوستو یہ آن دوستو
دنیا میں ہے ہماری یہ پہچان دوستو
تحفہ ہے ارضِ پاک یہ بابائے قوم کا
یہ ارضِ پاک اسکا ہے احسان دوستو
تعبیر سے سجانا ہے اس خواب کو ابھی
رکھنا ہے زندہ خواہشِ بے تاب کو ابھی
کرنا ہے وا ترقی کے ہر باب کو ابھی
کچھ اور جگمگانا ہے مہتاب کو ابھی
آیا تھا بن کے سبز رتوں کا نقیب وہ
کرنا ہے عام منظرِ شاداب کو ابھی

تمہیں تو سب پتہ ہے ناں

مری یہ نظم
پڑھنے سے ذرا پہلے
تم اپنے دل کے دامن کو
ذرا سا تھام لینا.....

اور
خزاں کو ذہن میں رکھنا
سنو جاناں......!
مجھے تو روتے چہروں کو عطا کرنی ہیں مسکانیں
مجھے تو بانٹنی ہے شہر کے لوگوں میں بینائی
بلا سے اپنے دل کی کرچیوں سے کام، مجھ کو لینا پڑ جائے
میں لکھتی ہوں
تو لکھنے سے مری اس مختصر سی زندگی کو دائمی اک نام ملتا ہے
مجھے آرام ملتا ہے
مگر تم تو سمجھتے ہو
تمہیں تو سب پتہ ہے ناں
فسانے، رت جگے، نظمیں مری غزلیں
حیاتِ بے اماں میں سانس لینے جتنی لازم ہیں
یہی بس وہ حرارت ہے
جو خوں بن کر رگوں میں سرسراتی ہے
تمہیں تو سب پتہ ہے ناں
ہمارے درمیاں اک ہجر کی رت ہے
مگر اس ہجر کی رت کا
مہکنا بھی ضروری ہے
اسی سے عشق کی تکمیل ہوتی ہے
مجھے تم محفلوں میں
شعر پڑھتے، مسکراتے
زیر لب ہنستے ہوئے جو دیکھتے ہو ناں
تمہیں تو سب خبر بھی ہے

کہ
میں جو لفظ لکھتی ہوں
وہی میری حقیقت ہیں
مری یہ مسکراہٹ
جھوٹ ہے،
میرا بھرم رکھنے کی کوشش ہے
تمہیں معلوم ہے،
زندہ نہیں ہوں میں
تمہیں وہ قہقہوں کی بارشوں میں بھیگتی لڑکی
کبھی اب مل نہ پائے گی
میں لکھتی ہوں تو لکھنے سے
مجھے تو بانٹنی ہے شہر کے لوگوں میں بینائی
مجھے تو روتے چہروں کو عطا کرنی ہیں مسکانیں

ثمینہ سیّد

صدائے بازگشت

شبِ سیہ تھی اور لوگ محوِ کیفِ خواب تھے
بہار ہو خلوص کی یقیں کے لالہ زار میں

اُمڈ پڑے تھے ہر طرف سے بزدلوں کے قافلے
دِلوں کے ساز پہ گائیں ہم خوشی کے زمزمے

مجاہدینِ حق اُٹھے دلوں میں بھر کے روشنی
صدائے بازگشت ہے دیارِ پاک باز میں

سمٹ کے رہ گئے کثیر ظُلمتوں کے دائرے
مٹائیں مِل کے اَب سحر یہ دُوریاں یہ فاصلے

اُٹھا کے پرچمِ رسول دستِ عزم و شوق میں

محاذِ رزمِ وقت پر خدا پرست ڈٹ گئے

مجاہدوں کے عزم نے مٹا کے بھارتی جنوں

لکھے تھے دل کے خون سے جسارتوں کے حاشیے

بہا کے خوں لٹا کے جاں شہیدِ راہِ شوق نے

برائے اَمن جنگ کے کیے تھے فتح مرحلے

دیا ہے درس دوستی کا نانک و فرید نے

مگر ہیں شَر کی سوچ میں عداوتوں کے وسوسے

نکل کے ظُلمتوں کے اِس حصارِ دردناک سے

جلاؤ ہر طرف شعورِ زندگی کے قُمقمے

بُجھا کے ذہن سے فسونِ دُشمنی کی آگ کو

دل و نظر میں اَب جلاؤ دوستی کے ولولے

اکرم سحر فارانی

تمھارا خیر سے ہووے سفر تمام، حُسین !

دل و نگاہ میں تیرا ہے احترام، حُسین
مرے نبی کے نواسے مرے امام، حُسین

تمہارا گھر ہے زمانے میں نیکیوں والا
تمہارا گھر ہے زمانے میں نیک نام، حُسین

ترے مقام کو سمجھے تو کبریا سمجھے
بشر کی سوچ سے آگے ترا مقام، حُسین

جہان روک رہا ہے مگر نہیں رکتے
تمہارے نام کے صدقے ہمارے کام، حُسین

بہت کٹھن ہے مدینے سے کربلا کا سفر
تمہارا خیر سے ہووے سفر تمام، حُسین

بہت قلیل تھے پہلے بھی ہم نوا تیرے
بہت قلیل ہیں اب بھی ترے غلام، حُسین

عجب تو یہ ہے کہ سر کو کٹا کے سجدے میں
سناں کی نوک پہ کرتا ہے تُو کلام، حُسین

تمہارے نام سے خائف یزید کے ساتھی
تمہارے نام سے خائف سپاہِ شام، حُسین

سوائے حضرتِ عباس کے نہیں کوئی
کرے جو دشت میں پانی کا انتظام، حُسین

وہی امام جو غیبت میں رہ رہا ہے کہیں
ضرور لے گا تمہارا وہ انتقام، حُسین

یزیدِ وقت کے قدموں میں جا کے بیٹھ گیا
وہ جس نے یاد نہ رکھا ترا پیام، حُسین

میں چاہتا ہوں جواب سلام بھی آئے
اگر قبول ہے میرا تجھے سلام، حُسین

انصر حسن

یومِ دفاع پاکستان.....

یوم دفاع ملک منانے کے واسطے
پرچم کو رفعتوں پہ اڑانے کے واسطے

پھولوں میں اتحاد کی خوشبو ہے لازمی
گلشن کی آبرو کو بچانے کے واسطے

برسایئے خلوص اخوت کے کھیت پر
پودے ترقیوں کے اگانے کے واسطے

روحیں یہ کہہ رہی ہیں شہیدانِ قوم کی
ہو جاؤ ایک خود کو بچانے کے واسطے

حبِ وطن کی شمع دلوں میں جلایئے
تاریکیٔ حیات مٹانے کے واسطے

ہر سو نظامِ دینِ رسالت کی دو اذاں
سویا ہوا نصیب جگانے کے واسطے

جرأت کو پاک فوج کی ہم سب کریں سلام
اخلاص کا شعور دکھانے کے واسطے

مٹی میں اپنے خون کی بوندیں اتار کر
گھر سے نکل پڑے ہیں خزانے کے واسطے

روشن کرو چراغ رفاقت کے اے نوید
منزل کو عظمتوں کی سجانے کے واسطے

محمد نوید مرزا

جاگتی اُمید

چھت پر کہیں کہیں جالے ہیں
پنکھے پر مٹی کی تہیں جمی ہیں
دیواریں ہیں میلی میلی
جن پر کچھ تصویریں ہیں
تصویروں سے جھانک رہے ہیں خواب کسی کے

الماری میں چند کتابیں اور خطوط
جن میں یادیں پڑی ہوئی ہیں
جن پہ نشاں ہیں پوروں کے
جن میں خوشبو رچی ہوئی ہے اُن سانسوں کی
پڑھتے وقت مہک اُٹھتا تھا جن سے کمرا
دیواروں کا رنگ نمایاں ہو جاتا تھا

لیکن اب تو کوئی نہیں ہے کمرے میں
پھر بھی سوندھی سوندھی خوشبو آتی ہے
دیواروں پر شکل کسی کی بنتی ہے
دروازے پر دستک ہونے لگتی ہے
لگتا ہے کوئی چھپا ہوا ہے
جس کی آنے لگتی ہے آواز
جو کانوں نے پہلے کہیں پر سُنی ہوئی ہے

اِس تنہائی میں رونق ہے
دل بہلانے کا سامان
اور زخموں کے بھر جانے کا ہے امکان
گرچہ پاس تو کوئی نہیں ہے
ہر شے وہیں پر پڑی ہوئی ہے
سب کچھ نیند میں ڈوب گیا ہے
لیکن اِک اُمید مسلسل جاگ رہی ہے کمرے میں

ظہور چوہان

نظم

سنو اس گرم موسم میں
کوئی اک ابر کا ٹکڑا
کوئی اک تازہ رو جھونکا
کوئی اک پھول سا مصرعہ
کوئی اک خواب سا چہرہ
ہماری سمت بھیجو نا
کوئی پیغام بارش کا
سنو اس گرم موسم میں
مدھر لے میں غزل کوئی
صبا پر ور کنول کوئی
کسی شاخِ تمنا پر
کوئی سرسبز سا وعدہ
ہماری سمت بھیجو نا
کسی امید کا دریا
کسی پربت کا سندیسا
کسی جھرنے کا آوازہ
کوئی جملہ محبت کا

اصغر علی بلوچ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس نے بسایا شہر ہمارا
ظلم کی اینٹیں ، جبر کا گارا

رنگوں کی سائنس

وہ
کلر تھراپی سے
میرا علاج کرنا چاہتا ہے

نجانے
رنگوں کے باطن میں
شفا کے کتنے راز
منکشف ہونے کے منتظر ہیں
خاصیت کا محلول
جادوئی اثرات پھیلانے کی
خواہش میں مبتلا ہے
وہ جانتا ہے
فوٹان کے کرشمے
رنگوں کے انسانی نفسیات پر اثرات
ہماری روزمرہ زندگی میں شعاعوں کی منطق

ہم مختلف رنگوں سے
صحت اور خوشی
ذہنی سکون
بہتر رویے کا حصول
ممکن بنا سکتے ہیں

وہی خدا
روشنی کو تاریکی سے الگ کرتا ہے
چاہے آسمانی بجلی ہو
سورج، چاند، ستاروں کی روشنی
انسانی تخلیق بھی رنگوں سے خالی نہیں
جڑی بوٹیوں کے رنگ
قوس قزح، درختوں، پھلوں کے رنگ
بادلوں، پھولوں، دیواروں کے رنگ

ہم
رنگوں کی سائنس سے
کتنے بے خبر ہیں
یہ بھی نہیں جانتے
ہمارے لیے کون سا رنگ
فلاح کا باعث ہے
اور ہمیں غموں کے گرداب میں
کون سا رنگ دھکیل رہا ہے

امجد بابر

نثری نظم

خواب خوبصورت تھے
لیکن تعبیر بہت بھیانک
راہگزر پر خار بونے والے ہاتھ زخمی تھے
گلاب رستوں پر خون کے نشان ثبت
آنکھیں روشنی میں دیکھ نہیں سکتیں
منظر کو روشن کرنے کی کوشش میں
سورج کو بجھانے نکلے تھے
زمین پر قحط کی کاشتکاری خود ہی کی تھی
اب بھوک دروازے پر دستک دیتی ہے
اور پیاس پانیوں کو ترستی ہے
زمین بنجر ہوگئی ہے
اور بادل جیسے آسمان کا راستا بھول بیٹھے ہیں
بارشیں اب نہیں برستیں
بستیوں میں دھول اڑتی پھرتی ہے
خوشیوں کے مرقد پر لگے کتبے بھی
دھندلانے لگے ہیں
بنائے ہوئے رستوں پر
سدھاء ہوء سوچ کے ساتھ
زندہ لاشے محو خرام ہیں
منزل لاحاصل ہے
اور دکھ مقدر

نائلہ راٹھور

نعتیہ نظم

عالم جتنا بھی چارسُو ہے
وہ آپؐ کے دم سے مشکبُو ہے

اے ماہِ منیر ، ماہِ طلعت
وہ آپؐ سے ہے جو رنگ و بُو ہے

ہے آپ کا لہجہ شہد جیسا
اور پھولوں جیسی گفتگو ہے

ہے خُلد کا وہ حسیں محلّہ
یثرب میں آپؐ کی جو کُو ہے

جو آپؐ کی بزم ہے وہاں پر
ہارون بھی آیا با وضو ہے

ہارون رشید

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ شام چاند تھا خالد تو صبح سورج تھا
مِرے فلک سے نہ اُترا فراق کا تارا

دور شہروں سے کارخانے ہوں

تن درستی ہزار نعمت ہے
کیسی دولت یہ اپنی صحت ہے
ہم کو تازہ ہواؤں میں عاصم
پرسکوں ان فضاؤں میں عاصم
چار دن سکھ کا سانس لینے دو
مست مستی میں اپنی رہنے دو
ہم کو رہنے دو مل کے اپنوں میں
لالچی مت ہمیں بناؤ تم
خواب پیسے کے مت دکھاؤ تم
کب غریبوں کی ہے یہ غمخواری
ایسی آبادیاں کہاں چاہیں
ایسی بربادیاں نہیں چاہیں
ہم کو ایسے ہی سانس لینے دو
روشنی یہ نصیب ہو تم کو
ہم کو تاریکیوں میں رہنے دو
کھیتی باڑی ہماری رہنے دو
کچھ روایت ہماری رہنے دو
ہم نے دیکھے ہیں کارخانے بھی
جانتے ہیں فیوض بھی ان کے
مانتے ہیں فیوض بھی ان کے
ساتھ ان کے ہزار بیماری
گر ہے ان دیکھی کوئی مجبوری
لازمی ہیں اگر لگانے بھی
دور شہروں سے کارخانے ہوں

عاصم بخاری

کیا تمھیں یاد نہیں

کیا تمھیں کچھ بھی وہ سب یاد نہیں
کیا تمھیں یاد نہیں
ہم جو زندہ تھے کہیں مصر کے اہراموں میں
ساحلِ نیل پہ ملتے تھے کبھی شاموں میں
ہم جو گونجے تھے کبھی وقت کے ہنگاموں میں
یہ ہے وہ عشق جو بدلا ہے کئی ناموں میں
تم نے ہر بار پکارا تھا مجھے شدت سے
میں نے بھی کتنے اجنتا میں جلائے تھے چراغ
سرحدِ وقت پہ میں نے بھی سجائے تھے چراغ
یہ جو مانوس سے لگتے ہیں ہم اک دوجے کو
ہم نے ہی مل کے زمانوں کے بجائے تھے چراغ
کیا تمھیں یاد نہیں
کئی تہذیبوں میں مدفن ہیں ہماری یادیں
کتنے ادوار میں چمکی ہیں سنہری یادیں
یہ تو روحوں کا ملن ہے جو کئی صدیوں سے
دائرہ وار سفر کرتی رہی ہیں یونہی
ہم پہ کھلتے ہیں جو افلاک کے اسرار و رموز
ہم نے لکھنے ہیں صحیفے جو محبت کے ابھی
سلسلے چلنے ہیں افکار و بصیرت کے ابھی
پھر وہی گیت اساطیری سناؤ مجھ کو
ہاں تمھیں مجھ سے محبت ہے، بتاؤ مجھ کو
اب بھی گر یاد نہ آیا جو تمھیں
کیا خبر دل کا چمن پھر کبھی یوں ہو کہ نہیں
شاخِ امید کوئی سایہ فگن ہو کہ نہیں
جس سے روشن ہیں در و بام تمہارے دل کے
چاندنی ایسی کوئی سیمیں بدن ہو کہ نہیں
جگمگاتی یہ محبت کی کرن ہو کہ نہیں
کیا تمھیں کچھ بھی وہ سب یاد نہیں

فرح اقبال

ریزہ ریزہ

سجے ہیں پاؤں میں گردش کے گھنگھرو
غموں کی تھاپ پر اب دھیرے دھیرے
ہماری دھڑکنیں رقصاں ہیں دل میں

ہماری آنکھ میں وحشت کے صحرا
بگولے درد کے اڑنے لگے ہیں
ہمارے خواب بھی ہیں ریزہ ریزہ

ہمارے لب پہ تالے مصلحت کے
جو شمع آرزو کی جل رہی تھی
ہوا کے سامنے لرزاں ہے اب تو

چھپائی تھی زمانے سے جو ہم نے
وہ غم کی داستاں کہنے لگے ہیں
ہماری پلکوں پہ رخشاں ستارے

تسنیم کوثر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

زخم لگا تھا مگر لہو نہ بہا تھا
بحرِ خموشی تھا میں ، وہ سنگِ صدا تھا

''ریت کی دیوار''

آسناتھ کنول

سامنے اِک ریت کی دیوار تھی
دیوار پر چہرہ بنا تھا
آس کا اُمید کا اور سوچ کا
ریت کی دیوار کیا جانے
کہاں سے ریت آئی
کن چٹانوں کے پگھلنے
ٹوٹنے سے اِس کو یہ چہرہ ملا ہے
اِس کے خدوخال بھی
سارے ہوا تھے
اُڑ کے آئے تھے کہیں سے
یا کہیں اِس ریت کے
نیچے دبے تھے
ریت کے نیچے بہت سے
پانیوں کے عکس تھے
اِک سمندر تھا جو بہتا جا رہا تھا
آب تھا اِک سراب
آنکھ کے کچھ منظروں میں گم تھا
ریت کی دیوار پہ لیکن لکھا تھا
اِن سرابوں اور خرابوں میں
کسی کو سوچنا بھی خواب ہے
اِک بڑا سا اَن کہا سا باب ہے
ریت کی دیوار پہ نقشِ کہن رہتے نہیں
چہرے بنتے ہیں مگر
چہرے یہاں رہتے نہیں

نظم

شائستہ رمضان

کچھ لوگ امر ہو جاتے ہیں

خود سے بے خبر ہو جاتے ہیں

وہ ہجر کی مالا جپتے ہیں

وہ تنہا راستے چلتے ہیں

وہ من کی بولی سنتے ہیں

آنکھوں کے دیپ جلاتے ہیں

کچھ رنگ ادھورے رکھتے ہیں

انہیں بھرنے سے کتراتے ہیں

یک رنگی اوڑھے رکھتے ہیں

سب کا جیون مہکاتے ہیں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دیواروں کے شگاف خالد
یادوں کی چھتوں تک آ گئے ہیں

یاد ہی نہیں رہتا!

بسترِ علالت پر
یاد ہی نہیں رہتا
کس سے بات کرنی ہے
کس کی بات کہنی ہے

بسترِ علالت پر
دھیان کے جھروکوں میں
دُھند میں اَٹے منظر
دور کی سناتے ہیں

بسترِ علالت پر
یاد آنے لگتے ہیں
وہ جو دھیان کی رَو میں
برسوں پہلے رہتے تھے
کون؟ کون؟ جانے کون؟
یاد آنے لگتے ہیں

کس کا خط کل آیا تھا
کیا جواب لکھنا ہے
بسترِ علالت پر
یاد ہی نہیں رہتا

کون سی پریشانی
کون رُخ بکھیرے گی
کس طبیب کی شفقت
ساتھ چھوڑ جائے گی
بسترِ علالت پر
کچھ سمجھ نہیں آتا

سائے، شام، تنہائی
دوستوں کے اندیشے
خیر خواہ سندیسے
بسترِ علالت پر
کون کام آتے ہیں

بسترِ علالت پر
شعر بھول جاتے ہیں!

نوید صادق

جسم کی بھیڑ میں آگے بڑھتے ہوئے

جسم کی بھیڑ میں آگے بڑھتے ہوئے

ایک چہرہ، کئی خواب مٹی میں مٹی ہوئے

جسم کی بھیڑ میں آگے بڑھتے ہوئے

دل بھی پگلا گیا

آنکھ سرمہ ہوئی

اور سرمہ کئی اور آنکھوں میں بجتا گیا

دل چراغوں کی لو کا ہنر سیکھ کر آ گیا

ڈولتا ڈوبتا مجھ سے کہنے لگا

تیری آنکھوں میں جو سرمئی شام کا خواب تھا

دانہ کیسے بنا دام کیسے ہوا

ایک شوریدہ سر رام کیسے ہوا

جسم کی بھیڑ میں آگے بڑھتے ہوئے

اعجاز رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پسِ لب و رُخِ اعدا رہا مرا پیارا

نہ اُس سے جیت سکا میں، نہ مجھ سے وہ ہارا

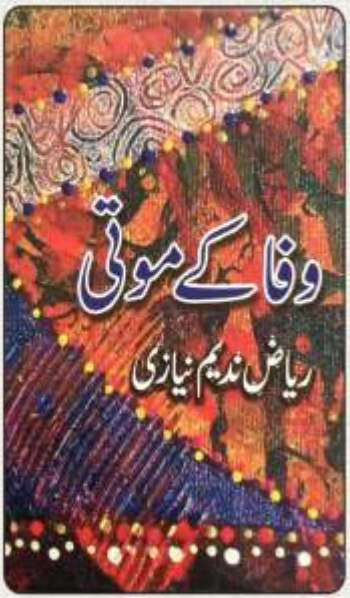
وفا کے موتی
ریاض ندیم نیازی

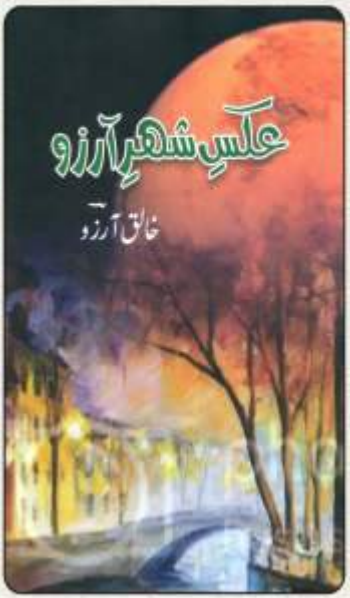
عکسِ شہرِ آرزو
خالق آرزو

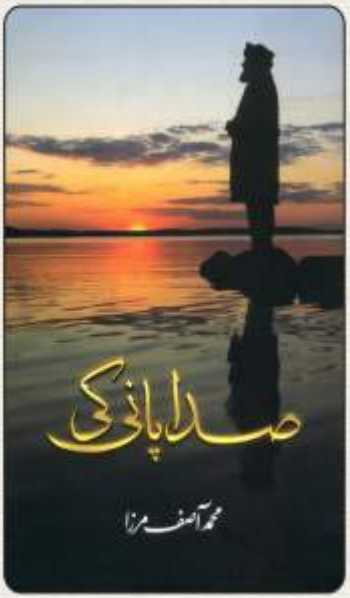
صدا پانی کی
محمد آصف مرزا

کھلا باب سخن
محمد آصف مرزا

میجر عزیز بھٹی شہید

کیپٹن محمد سرور شہید

میجر شبیر شریف شہید

میجر طفیل محمد شہید

سوار محمد حسین شہید

میجر محمد اکرم شہید

پائلٹ راشد منہاس شہید

کیپٹن کرنل شیر خان شہید

لانس نائیک محمد محفوظ شہید

حوالدار لالک جان شہید